زرد ہتھیلا
اور دوسری کہانیاں
جیم عباسی
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جیم عباسی

زرد ہتھیلی

جیم عباسی

زرد ہتھیلی

اور دوسری کہانیاں

جیم عباسی
زرد ہتھیلی
اور دوسری کہانیاں

پہلی اشاعت: 2020

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت: واحد آرٹ پریس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 35650623 (21-92)
ای میل: cpkarachi2020@gmail.com ajmalkamal@gmail.com
ویب سائٹ: www.citypressbooks.com

ترتیب

اپنے ماموں

طاہر بخشی

کے نام

نوری

عمر کا وہ حصہ ہے جس کو سارتر کا ایک قول عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ لکھتا ہے: ''ایک ہی دن ہے اور وہ بار بار آتا ہے۔ یہ فجر کے وقت ہمیں دیا جاتا ہے اور بوقت مغرب چھین لیا جاتا ہے۔'' اب یہ بھی بات نہیں کہ عمرِ نوح میں ہوں۔ نہیں نہیں، اچھے برسوں میں ہوں، لیکن جتنا دیکھا اور محسوس کیا ہے، اس میں تسلسل اتنا ہے کہ ہر دن، ہر برس ایک سا لگتا ہے۔ وہی ہو رہا ہے جو ہوتا تھا۔ لگتا ہے ہوتا بھی وہی رہے گا۔ اس بات کو جان کر اب حواس پر کوئی غلاف چڑھ گیا ہے۔ حال یہ ہے کسی ماجرے، حادثے کا سنا تو ذہن ایک لگے بندھے مشینی طریقے مطابق اس سے نتائج اخذ کر کے ردعمل دیتا ہے۔ محسوسات کو آنچ نہیں آتی۔ لیکن ایک عجیب بات ہوئی آج۔ میرے ساتھ کچھ الگ ہو گیا۔ فلیٹ کی طرف جاتے جب میں اپنی گلی سے گزر رہا تھا تو نکڑ پر کچرا کنڈی کے پاس ایک نظارہ دیکھا۔ محسوسات پر ضرب پڑی۔ ایسی ضرب، جسم جھنجھنا بن گیا۔ گاڑی اندر کھڑی کر کے میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر فلیٹ میں پہنچا ہوں۔ یہاں آتے ہی کھڑکی کے قریب والی اس ٹیبل نے کھینچا جو میری لکھائی پڑھائی کے کام آتی ہے۔ ٹیبل پر اوپر تلے بے ترتیب کتابیں پڑی ہیں۔ ان میں پھٹتے آموں کا قصہ کے نام سے، پیلے رنگت کا ترجمہ کیا ہوا ناول بھی رکھا ہے جو پبلشر کے پاس سے اٹھا کر گم کر دیا گیا۔ میں دراز کھولتا ہوں۔ اس میں ڈھیروں ڈھیر قلم پڑے ہیں۔ اصل میں یہ میری افتادِ طبع ہے۔ جہاں قلم دیکھنے میں آیا، بے اختیار ہو کر اسے خرید لیا۔ وہ اس لیے کہ لکھتے وقت بہت مشکل ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے طبیعت کسی قلم پر آمادہ ہوتی ہے۔ ایسا قلم جو ہلکا ہو، لکھتے وقت رواں رہے، کاغذ پر اٹکے نہیں۔ باریک لکھائی ہو۔ تو اور کیا کیا بتاؤں، بس نری سر دردی ہے ایک یہ بھی۔ چلیے چھوڑیے اسے، ہم مدے پر آتے ہیں۔

آج شام کو پانچ ساڑھے پانچ بجے گھر لوٹتے وقت گلی میں آنکھ نے جو کچھ دیکھا وہ ایک ایسا لمحہ

تھا جو مجھے کئی دہائیاں پیچھے لے گیا۔

یہ ایک شام ہے۔ سورج اپنے آخری دم پر ہے۔ صحن کی مٹی پر چھڑکاؤ کے نشان ابھی باقی ہیں۔ موتیے اور گلاب کی کیاری کے ساتھ کھجوری پتوں سے بنی چٹائی بچھی ہوئی ہے۔ کیاری کے ساتھ ہی چٹائی پر شیشے کے چار جگ شربت سے بھرے رکھے ہیں جن کی بیرونی سطح پر قطرے پھسل رہے ہیں اور ان کے اندر رنگا رنگ پانی میں برف کے بلوری ٹکڑے پگھل رہے ہیں۔ پہلے جگ سے سبز رنگت جھلک رہی ہے جو نورس شربت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ میری چھوٹی خالہ کا پسندیدہ شربت ہے جس سے میں جڑا بیٹھا ہوں۔ دوسرے جگ میں شیزان کا لیموں والا کھٹا شربت ہے جو میری ماں کا ہے۔ وہ کسی اور کو آدھے گلاس سے ایک قطرہ زیادہ پینے نہ دے گی۔ اس جگ کے ساتھ تھوڑا مٹی جیسی رنگت والا معاذ تھادل سے بھرا جگ ہے جو نانا ابا کا ہے۔ وہ افطاری میں اسی جگ سے شربت پیتے ہیں۔ حالانکہ باقی سب ایک دوسرے کے جگ سے گلاس بھرتے ہیں لیکن نانا ابا معاذ تھادل کے علاوہ کسی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ مجھے بھی کہے جاتے ہیں:

''بیٹا، یہ تھادل پی تھادل۔ اس میں خشخاش ہے۔ کالی مرچ، سونف، چار مغز ڈلے ہیں۔ یہ پی لیا تو سمجھو دودھ کا گلاس پی لیا۔'' مگر میری نظر تو چوتھے جگ پر ٹکی ہے جس میں گہری پیازی رنگت والا گلابی شربت ہے۔ روح افزا اور دودھ سے بنا یہ شربت ماموں کا ہے۔ میرا دل کر رہا ہے اس میں سے گلاس بھر کر غٹ غٹ پی جاؤں مگر ابھی آذان کہاں آئی ہے۔ اور آئے تب بھی اس کے ختم ہونے سے پہلے نانی کسی کو کچھ پینے نہیں دیتیں۔

''آذان تو پوری ہو۔''

''او اللہ کی بندی، آذان کے ساتھ روزہ کھولتے ہیں۔'' نانا ابا کی بے بس آواز آتی ہے۔

''جاہل نہیں میں۔''

''مائی، پیاس مارے ڈال رہی ہے۔ اب تو اللہ نے بھی اجازت دے دی۔ تو یہ اپنا لیے بیٹھی ہے۔''

''پورا دن کچھ نہیں ہوا، باقی آذان کے دو بولوں میں تیرا دم نکل جائے گا؟'' نانی ہٹ کی پکی تھیں اس لیے کسی کو نہ چھوڑتیں۔ ادھر آذان ختم، ادھر سب ٹھنڈے شربت کے گلاس منہ پر چڑھانے

لگتے۔ ’’سدھرو پچھ! کھجور سے روزہ کھولتے ہیں۔ بس شربت پر ٹوٹے پڑ رہے ہو۔ یہ لے میرا بچہ۔‘‘ نانی مجھے کھجوروں کی پیالی سے کھجور پکڑاتیں۔ ’’تو اور میں کھجور سے روزہ کھولتے ہیں۔‘‘

’’تو نے روزہ رکھا تھا؟‘‘ ماموں شربت کا گلاس بڑھا کر مجھے دیتا ہے۔ میں جواب میں سر ہلاتا ہوں۔

’’کتنے روزے رکھے آج، بڑے ادا؟‘‘ نانا مجھ سے پوچھتے ہیں۔

’’میں نے چار روزے رکھے آج۔‘‘

’’اچھا! بھلا کیسے؟ بتا تو۔‘‘

’’صبح نانی نے چاول اور تلے آلو دیے تھے۔ ایک روزہ۔‘‘ میں انگلیوں پر گنتا جاتا ہوں۔ ’’پھر میں نے پانی پیا۔ دوسرا روزہ۔ پھر دوپہر نانی نے بھنڈیاں تل کر دیں۔ تیسرا روزہ۔ پھر ابھی شام کو آم کھایا تھا۔ چوتھا روزہ۔‘‘

’’اڑے گھوڑا اڑے۔ آم!‘‘ نانا چلا اٹھتے ہیں۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ’’بڑے ادا، آم کا ایسے نام نہیں لیتے۔ یہ بتا، تیرا وضو ہے جو آم کا نام لے رہا ہے؟‘‘

’’ہاں نانا۔ وضو ہے۔‘‘

’’چل پھر ٹھیک ہے یار۔ آم بڑی شے ہے۔‘‘

’’بچے سے وضو کا پوچھ رہا ہے اور خود مغرب پر نہیں جا رہا۔ واہ سائیں واہ۔ بس روٹی ہڑپ کیے جا رہا ہے۔ بے فائدہ ایسے روزے کا جو پانچ وقت نمازی رمضان میں چار وقتی ہو جاتا ہے؟‘‘

’’اڑے اللہ کی بندی، ہمارے ملے کو تکڑ (جلدی) ہے بہت۔ بولان میل چھوٹی جا رہی ہے اس کی۔ میں بڑی مسیت والوں سے پوچھ آیا ہوں، اللہ سائیں نے موکل دی ہے۔ کہا ہے، دل میں کھانے کی طلب ہے تو نماز سے پہلے کھانا کھاؤ۔ تمھیں اعتبار نہیں تو چل، تجھے کل مولوی دوست محمد کے سامنے بٹھاتا ہوں۔‘‘

’’میں کیوں جاؤں اس دوست محمد کے پاس؟ دیکھو تو سہی! اس نے جماعت پر نہ جانے کے لیے بھی کیسی کیسی باتیں ڈھونڈ رکھی ہیں۔ اب میں بیچاری اس کو پہنچ سکتی ہوں؟‘‘

’’اس ساری زمین پر ایک یہ بیچاری ہے اور ایک وہ کا ناضیا۔‘‘

"اس مروان سے ملاتا ہے مجھ کو؟ شرم نہیں آتی تمھیں؟ اس یزید کا نام لے کر کھانا حرام کر دیا مجھ پر۔ لے۔ اب خود ٹھونس جا کر۔" نانی کھانا چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

"اماں چھوڑ۔ ابے کی تو عادت ہے۔" اماں نانی کو منانے لگی، ماموں بھی خراب منہ کر کے نانا کو گھورنے لگا۔

"اڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ بس نکل گئی بات منہ سے۔ اڑے اللہ کی بندی، میں نے بس کی۔ اب بیٹھ جا۔" نانا نانی کو منانے لگ گئے۔

"بڑی بس کی ہے تو نے! مجھے جیسے نہیں پتا تیرا۔"

"تیری قسم، بالکل بس۔ اب بیٹھ، کھانا کھا، آج تو آم بھی کھانے ہیں۔ دیر نہ کر۔"

"آم ہیں کہاں؟ تو لایا تھا کیا آم؟"

"اللہ کی بندی، میں نہیں لایا تو کیا ہوا۔ یہ تو لے آیا ہے ناں۔ میں نے خود دیکھے، ادھر باورچی خانے میں بالٹی میں رکھے ہیں۔" نانا ماموں کی طرف اشارہ کر کے بولتے ہیں۔ نانی جواب دیے بنا کھانا کھانے لگتی ہیں۔ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ نانی بھی کھانا کھا چکی ہیں مگر وہ نانا کی آم کی متلاشی نگاہوں سے بے پروا بیٹھی ہیں۔ "اللہ کی بندی، اٹھ بھی اب۔" نانی کے انداز سے لگ نہیں رہا کہ نانی اٹھنے والی ہیں۔ "بھلا تو آم کاٹ کے لے آ دی۔" نانا چھوٹی خالہ سے بول پڑے۔

"چپ بیٹھی رہ! خبردار جو اٹھی ہے تو۔"

"توبہ ڑے توبہ! بڑے ادا، اٹھ تو۔ نانی اپنی کو راضی کر۔" نانا مجھے منت کرتے ہیں۔

"نانی، نانی۔ آم لے آ۔ نانی نہیں ہے۔" میں نانی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر پیٹھ پر لد جاتا ہوں۔

"کمر توڑے گا کیا میری۔ اتر نیچے۔"

"نانی آم لے آ ناں۔"

"دیکھ رہی ہوں، تو سارے کا سارا نانا کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔"

"نہیں نانی۔ میں تو سوتا بھی تمھاری چارپائی پر ہوں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ چل چھوڑ مجھے۔ جاتی ہوں میں۔" نانی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ "یہ اس

معصوم کی وجہ سے جا رہی ہوں ورنہ آم نہیں ملنے تجھے۔'' نانی جاتے جاتے پلٹ کر نانا سے بول پڑتی ہیں۔ نانی پیٹھ دے کر باورچی خانے کا رخ کرتی ہیں تو کیاری کے پیچھے گھاس کے قطعے میں کھڑی، گھاس پر منہ مارتی بکری نانی کے پیچھے چل پڑتی ہے۔

''اڑے شریف، اللہ تجھے نیکی دے، اٹھ۔ اس بکری کو تو روک۔ یہ تیری ماں آدھے آم اسے کھلادے گی یار۔'' ماموں کو کہتے نانا نے آواز نیچی رکھنے کی کوشش کی ہے مگر نانی سن لیتی ہیں۔

''میں دیکھتی ہوں کون نوری کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اور تو سنتا نہیں؟ لاکھ بار کہا ہے ناں تجھے، یہ نوری ہے، بکری نہیں۔'' نانی پھر واپس آ کر نانا کے اوپر کھڑی ہوتی ہیں۔

''اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، پر تو اسے باندھتی کیوں نہیں، اللہ کی بندی؟''

''عقل ہے تجھے یا نہیں؟ نوری کوئی رسی ہے جو باندھوں؟ حیا نہیں آتی۔''

''دیکھ بڑے ادا، دیکھ۔ اس بیبی بکری کے پیچھے ہم گالیاں کھا رہے ہیں۔ اب دیکھنا، یہ تیری نانی اپنی نوری کو آدھے سے زیادہ آم کھلادے گی۔''

''وہ آم ہوتے ہیں؟ چھلکے ہوتے ہیں چھلکے۔ شکر کر جو یہ بے چاری سارا گند چھلکے کھا جاتی ہے۔ نہیں تو سارا گھر تمھارے ان چھلکوں اور ڈنٹھلوں سے بو دیتا رہے۔''

''جو تو اسے کھلاتی ہے وہ چھلکے ہوتے ہیں؟ آدھے سے زیادہ آم تو ان چھلکوں کے نام پر اترتا ہے۔ تو ایسا کر، جو گکڑی مجھے دیتی ہے وہ اپنی نوری کو کھلا اور اپنی نوری والے چھلکے مجھے دے دے۔ ٹھیک ہے؟''

''توبہ! دیکھو تو، کھا کھا کر ایسا بن گیا ہے جیسے سات ماہ کا بچہ پیٹ میں ہو اور پھر بھی نوری کے چھلکوں میں آنکھیں لگائے بیٹھا ہے۔'' نانی غصے سے باورچی خانے جانے لگیں اور نوری ان کا پلو بنی خراماں خراماں چل دی۔

''اب سائیں، کون بات کرے۔ بات کرنے جیسا چھوڑا ہی نہیں تیری نانی نے۔ بڑے ادا، اٹھ تو، روک بکری کو۔ تجھے نانی کچھ نہیں بولے گی۔''

''سدھرنا نہیں تو نے! پڑھا اب اس چھوٹے کو اپنی پٹیاں۔''

''پھر باندھ کر کیوں نہیں رکھتی اسے اللہ کی بندی؟''

''او عقل کے اکابر، سن۔ بکری کا دودھ اس کے پاؤں میں ہوتا ہے۔ جتنا چلے گی اتنا دودھ دے گی۔ اسے باندھ دیا ناں تو پھر جو تو ابھی چائے چائے کی رٹ لگائے گا، وہ پانی میں بنا کر دوں گی پھر۔''

''ہماری بس ہو گئی۔ چل ٹھیک ہے، جو کرنا ہے کر لے۔ بس آم جلد لے آ۔'' نانا اٹھ کر نلکے کی طرف چلے جو صحن کے کونے میں ایک کچی چار دیواری میں لگا تھا۔ میں نانا کے پیچھے چل پڑا۔ نانا وضو کرنے لگے تو میں نلکے کو گیڑنے لگا۔

''او ہو ہو ہو۔ اتنا ٹھنڈا پانی! برف ہے برف۔'' میں نے نانا کی بات سن کر ہاتھ بڑھا کر پانی کی دھار میں ہاتھ ڈالا۔

''نانا، برف تو نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''نہ بڑے ادا۔ تو خود نلکا چلا رہا ہے اس لیے تجھے پتا نہیں چل رہا، باقی برف ہی برف ہے۔ بول تو قرآن کی قسم اٹھاؤں؟''

''نانا، نانا، وہ بتاؤ جو جت (جت ایک قوم کا نام جو اونٹ پالنے کے کام سے پہچان رکھتے ہیں) نے قرآن اٹھایا تھا۔'' میں مچل اٹھا۔

''بڑے ادا، وضو کر لوں تو بتاتا ہوں۔''

''نانا، ابھی سنا، ابھی سنا۔''

''یاررر، یار، یارر۔ تو زور آور ہے۔ صفا نانی پر گیا ہے۔ چل سناتا ہوں۔ ایک جت نے کی چوری۔ فیصلہ وڈیرے کے پاس گیا۔ اب چوری تو ہوئی برابر، پر ثابتی شاہدی کوئی نہیں تھی۔ مالکوں نے بولا، جت قرآن اٹھائے اس نے چوری نہیں کی۔ جت نے کہا، کون سا قرآن اٹھانا ہے؟ دکھاؤ۔ مسیت سے جا کر قرآن لے آئے۔ جت سے بولا، یہ قرآن اٹھاؤ گے کہ تم نے چوری نہیں کی؟ جت بولا، ہاں۔ ایسے میں دس اٹھا جاؤں۔ وڈیرا سیانا تھا۔ وہ بات سمجھ گیا۔ جت سے بولا، ٹھیر جا۔ یہ قرآن تو ہے، پر تجھے سرخ قرآن اٹھانا ہے۔ وڈیرے نے کیا کیا، جو کھیت میں رہٹ چل رہا تھا، اس کو بڑی سرخ چادر اڑھا دی۔ جت کو وہاں لے جا کر بولا، یہ ہے سرخ قرآن۔ اب اسے اٹھا کر بول، تو نے چوری نہیں کی۔ جت کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا، نہ سائیں۔ یہ قرآن میرا باپ بھی نہ اٹھائے۔ میں مانتا ہوں، میں نے چوری کی ہے۔ خوش اب خوش؟'' نانا بات سنا کر گیلے ہاتھوں سے مجھے گدگدی کرنے لگے۔ ہنسی

سے میرے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ میں اچھلتا کودتا نانا کے ساتھ چٹائی کی طرف واپس آتا ہوں جہاں نانا چٹائی کے ایک کونے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ساتھ ان کی نقل کرتا جاتا ہوں۔ نماز کے پورے ہوتے آموں کا تھال چٹائی پر پہنچ جاتا ہے اور سارے مل کر کھانے لگتے ہیں۔ پر نانا کے کھانے کا انداز سب سے الگ ہے۔ وہ دوزانو ہو کر تھال کے قریب بیٹھتے ہیں اور آم کھانے لگتے ہیں۔ سچ کہوں تو ایسے مزے سے آم کھاتے زندگی میں کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ آم کی پھانک اٹھاتے اور اسے کھاتے ہوئے لذت سے سسکاریاں لیتے جاتے۔ ''سائیں وَہوا! سبحان اللہ۔ کیا بات ہے۔ آہاہاہا۔ مزہ آ گیا۔'' کے الفاظوں کے ساتھ لایعنی قسم کی آوازیں نکالتے جاتے۔ نانی تپنے لگتیں۔

''فضیلت سے کھا، فضیلت سے۔ سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' نانی بولنے لگتیں اور نانا اپنے ''آہاہاہا، ہے ڑے ہے'' میں لگے ہوتے۔ نانی کو تنگ آ کر وہاں سے اٹھنا ہی پڑتا۔

''کیسے بڑے ادا؟ یہ دو پھانکیں اور بچ گئیں۔'' نانا بائیں آنکھ میچ کر مجھے کہتے ہیں۔ نانی غصے میں تھال اٹھا لیتی ہیں۔ ''اڑے گھوڑا ڑے۔ یہ اللہ رسول کی جھولی ہے تجھے، ایسا تو نہ کر۔ میرے باپ دادا کی توبہ جو ایسے آواز نکالوں اب۔ لیکن یقین کر مراد خاتون، میں کچھ نہیں کرتا۔ میں صفا شریف آدمی ہوں۔ یہ منھ میرا کم بخت ایسا ہے جو آپ آوازیں نکالتا ہے۔ تو اگر کہے تو اسے درزی سے کل ہی سلوا دیتا ہوں۔''

''درزی سے کیوں، میں سوئی دھاگا لے کر خود نہ سی دوں تیرا منھ؟ ایسے برے برے آواز نکالتا ہے کہ الٹی آتی ہے مجھے۔ فضیلت سے نہیں کھا سکتا؟''

''بس۔ اب فضیلت سے۔ صفا منھ بند۔'' نانا کی بات کے بعد نانی تھال واپس رکھتی ہیں اور ایک دو لمحوں کے بعد وہی سسکاریاں اور وہی آواز۔ نانی پھر اٹھ جاتیں اور ان کے پیچھے پیچھے میری ماں نانا کو ناراض نظروں سے دیکھتی نانی کے پیچھے چلی جاتی۔

اب اس عمر میں میں سوچتا ہوں تو یہ بات تعجب میں ڈالتی ہے کہ اماں اور نانی ہر وقت کیا باتیں کر رہی ہوتیں تھیں۔ اتنی باتیں، جیسے وہ باتوں کی بادشاہ ہوں۔ ورنہ ایک آدمی اتنی باتوں کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ اب یہ دیکھیں کہ نانی چارپائی پر بیٹھی چاولوں میں سے کنکر چن رہی ہیں اور پائینتی پر بیٹھی اماں

ان سے باتیں کیے جارہی ہے۔ برآمدے میں نیچے رلی بچھائے نانی پرانے کپڑوں کو کترن میں بدل رہی ہیں اوراماں کھٹولی پر پر بیٹھی بولے جارہی ہے۔نانی کترن چھانٹ رہی ہیں اوراماں ان سے لگی آنچل کا پلو منھ میں دبائے ہنسے جارہی ہے۔نانی میرے پرانے سویٹر کوادھیڑ کر بڑا بنارہی ہیں اوراماں جیسے اس سے کوئی راز پوچھ رہی ہے۔نانی سوکھی روٹی سے کھچڑا بنانے کی تیاری میں باورچی خانے کے اندر ہیں اوراماں ان کو پنکھا جھلتے ہوئے پھسکڑا مارے بیٹھی ہے۔نانی ایک کیاری میں لگی سبزیوں کی گوڈی کررہی ہیں اوراماں اپنی پرائی کہے جارہی ہے۔اورہاں۔نوری بھی ہرجگہ ان کے ساتھ ساتھ پھر رہی ہے۔جب کسی وقت اماں اورنانی کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں تووہ ان دونوں کے بیچ اپنا منھ گھسانے کی کوشش کرنے میں نانی سے دھپ کھاتی ہے۔نانی دھپ مارنے کے بعد پھراسے پیار سے گلے لگالیتی ہیں۔

میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوں۔میری نگاہیں کھڑکی کے باہراس کونے پر ٹکی ہیں جس میں موجود گھونسلے کو آج چڑیا نے مکمل کرلیا ہے۔اس کی آٹھ نو سہیلیاں اور ایک طوطا مبارک دینے آئے ہیں۔بات نظارے کی رہ گئی جو کچرا کنڈی کے پاس دیکھ کر میرے اندر یادوں کا ایک جنگل اگنے لگا۔ایک لاغر بکری کچرا کنڈی پر کھڑی پلاسٹک کی تھیلی چبائے جارہی تھی۔

❁❁

مفتی

مفتی سجاد حسین پھر نماز پڑھاتے ہوے بھول پڑے۔ فجر کی نماز میں پہلی رکعت مکمل کر کے تشہد میں بیٹھ گئے۔ مسجد کے قدیمی نحیف و ناتواں موذن گل محمد نے مفتی صاحب کو خبردار کرنے کے لیے پہلے تو اپنی بلغمی آواز میں کھنکھاریں ماریں، مگر مفتی صاحب لاتعلق و بے خبر رہے، تب گل محمد کو "اللہ اکبر" کی آواز بلند کرنی پڑی۔ لیکن مفتی صاحب نے التحیات، درود، دعا پڑھ کے سلام پھیرا اور مقتدیوں کی طرف منھ کر کے بیٹھ گئے۔ مقتدیوں کی صف سے بھنبھناہٹ ابھرنے لگی۔ گل محمد چاندیو آگے ہو کر مفتی صاحب سے مخاطب ہوا:

"مفتی صاحب، آپ نے ایک رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ نماز دوبارہ ہوگی۔"

الفاظ سماعت تک پہنچے تو مفتی صاحب کو جھٹکا لگا۔ "اچھا! واقعی؟" انھوں نے خفت بھری آواز میں حاجی نزاکت علی سے استفسار کیا جو موذن کے دائیں طرف بیٹھے ہوے تھے۔

"جی مفتی صاحب، ایسا ہی ہے۔ جلدی نیت باندھیں اور تکبیر کہیں،" حاجی نزاکت نے ترشی بھرا جواب دیا۔ حاجی کو اب یہ خیال ستائے جا رہا تھا کہ پھر مفتی صاحب کے پیچھے کھڑے ہو کر سست رفتار نماز پڑھنی پڑے گی، یعنی دس کہ بارہ منٹ اور لگ جائیں گے۔ مفتی صاحب مجرمانہ احساس لیے نچلی نظروں کے ساتھ اٹھے اور تکبیر تحریمہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ تب پہلی رکعت کے بعد پہنچنے والے وہ نمازی اپنی نماز توڑ کر نئی جماعت میں شامل ہوے جو ابھی تک قیام میں کھڑے کن انکھیوں سے یہ ماجرا دیکھے جا رہے تھے۔

یہ کچھ عرصہ پہلے ہی شروع ہوا تھا کہ مفتی سجاد حسین سے نماز پڑھاتے ہوے تواتر سے غلطیاں

سرزد ہو رہی تھیں۔ کبھی وہ ظہر یا عصر میں بلند آواز سے قرأت شروع کر دیتے، کبھی مغرب اور عشا میں چپ سادھے کھڑے رہتے۔ کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ تشہد میں بیٹھے بیٹھے ان سے سلام پھیرنا بھول جاتا۔ پیچھے کھڑا انگل محمد کھنگاریں مارتا رہتا اور حاجی نزاکت پیچ و تاب کھاتا رہتا۔ حاجی نزاکت شہر کی گڑ منڈی کا مشہور بیوپاری اور مسجد کمیٹی کا نائب صدر تھا۔ روپے پیسے کے بارے میں بخیل اور اپنے وقت کو بھی پیسوں میں تولنے کا عادی۔ جب نماز میں مفتی صاحب لمبی سورت شروع کرتے یا اب کے دنوں مفتی صاحب سے ہو جانے والے سہو کی وجہ سے دوبارہ نماز پڑھنی پڑ جاتی تو حاجی نزاکت کو لگتا کہ بہت مہنگی نماز اس کے پلے پڑ گئی ہو۔ وہ ضبط کیے نماز میں دھیان لگانے کی کوشش کرتا رہتا مگر اس کا من طے کردہ سات منٹ کے بعد دوڑا دوڑا دکان کی طرف جاتا رہتا۔ مفتی عبدالجبار کی پر تقدس شخصیت کی وجہ سے وہ اپنی زباں پر تالا لیے رہتا حتیٰ کہ پیٹھ پیچھے خیال آرائی کی ہمت بھی ٹوٹتی رہتی۔ مفتی عبدالجبار نہ صرف مسجد میں امامت کرواتے تھے بلکہ ساتھ واقع جامعہ دارالاحسان میں درجہ حدیث کے طلبا کو پڑھانے کے ساتھ دارلافتا کے نگران کی حیثیت سے فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی نبھاتے تھے۔ یہ کام وہ پچھلے پچیس سالوں سے مسجد کمیٹی کے صدر اور جامعہ دارالاحسان کے مہتمم علامہ روح الامین کے والد اور جامعہ کے بانی مولوی عبداللہ فاضلی المعروف 'بڑے میاں جی' کے دور سے ادا کیے جا رہے تھے۔ اس کے عوض وہ تنخواہ یا مشاہرہ کچھ بھی نہ لیتے تھے؛ بس عید برات پر ان کا کوئی عقیدت مند کپڑوں کا جوڑا لے آتا، محلے کے گھر سے ان کا تین وقت کھانا آ جاتا اور اللہ اللہ خیر صلا۔ انھوں نے اپنی ضروریات محدود کرنے کو زندگی کا جز بنائے رکھا تھا۔ حتیٰ کہ بشری تقاضوں کو بھی انھوں نے نفسانی خواہشات کا نام دے کر اپنے آپ سے پرے رکھا تھا۔ شادی اس لیے نہیں کی کہ کہتے تھے کہ بیوی اور اولاد ایسی آزمائشیں ہیں جو بندے کا ایمان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔ شہر بازار کو شیطانی گھر سمجھتے، اس لیے اس طرف کا کبھی رخ نہیں کیا۔ وہ نماز کے وقت مسجد میں اور بقیہ سارا وقت جامعہ کی لائبریری میں بیٹھے رہتے۔ تدریس اور فتوے کا کام بھی وہیں انجام دیتے۔ بس آرام کرنے اپنے حجرے میں جاتے۔ دو منزلہ مسجد کے وسیع صحن کے دائیں جانب، صحن سے متصل ہی جامعہ کی نصف

قطر کے دائرے میں پھیلی ہوئی عمارت تھی، جواب زبوں حالی کی علامت نظر آتی۔ تدریسی کمروں کے بیچ میں ہال نما لمبا کمرہ تھا جو اندر کتابوں سے بھری بے ترتیب الماریاں لیے لائبریری بنا ہوا تھا۔ لائبریری کے ہمیشہ کھلے رہنے والے شیشم کے دروازے کے سامنے مفتی صاحب مشرقی دیوار سے پشت لگائے اپنی نشست گاہ پر بیٹھے پڑھتے یا پڑھاتے رہتے۔ نشست گاہ کے سامنے اور جنوبی طرف ڈیسک پڑے رہتے تھے جن پر مفتی صاحب کے زیر مطالعہ کتابوں کا ہجوم جمار ہتا تھا۔ اسی نشست گاہ پر مفتی صاحب کی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ گزرا تھا۔ پڑھ کر جوں ہی اِفتا کا نصاب مکمل کیا تو بڑے میاں جی نے انھیں جامعہ دارالاحسان میں مدرس مقرر کر دیا۔ اور وہ کچھ بولے بنا سعادت مندی سے پڑھانے بیٹھ گئے تھے۔ گھر والوں سے پوچھنا تو درکنار خبر بھی نہ کی تھی۔ خود مفتی صاحب کا پڑھنے کے لیے جامعہ میں آنا بھی ایک عجب داستان تھی جسے بڑے میاں جی ہر محفل چاہے خطاب میں فخریہ بیان کرتے تھے۔ کہتے:

''جب میں درس نظامی مکمل کر کے دین کی خدمت کے لیے یہاں آیا تو لوگوں کی دین سے دوری دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ مسجدیں ویران اور اوطاقیں آباد تھیں۔ کوئی نماز پڑھنے، اذان کہنے والا نہیں تھا۔ اس مسجد میں تو کتیا نے کتورے جن رکھے تھے۔'' یہ جملہ سن کر سامعین کے منھ سے توبہ توبہ کی آواز نکل جاتی اور باز تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگ جاتے۔ ''یہ بے دینی دیکھ کر ارادہ کیا کہ یہیں رہ کر اس مسجد کو دین کی روشنی سے منور کرنا ہے۔ میں نے مسجد کو صاف کر کے کتیا کو باہر نکالا اور عصر نماز کی اذان کہی۔ اذان کی آواز سن کر محلے والے متحیر ہو کر باہر نکل آئے۔ میں نے انھیں نماز کی عرض کی تو اکثریت بڑبڑاتی رخصت ہوگئی۔ ایک دو نیک دل باوضو ہو کر نماز کے لیے آئے۔ نماز کے بعد ان سے بات چیت ہوئی۔ انھوں نے میری آمد پر خوشی ظاہر کی۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں تو کوئی اسلامی تعلیم رکھنے والا ہے ہی نہیں۔ خدا کا احسان ہے اس نے آپ کو رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔ اب آپ ہم پر احسان کریں۔ یہاں ٹھہریں اور ہمیں گمراہی سے بچائیں۔ ان کی یہ بات سن کر میرا جی بہت خوش ہوا، کیونکہ میں تو پہلے ہی یہ نیت کیے بیٹھا تھا کہ اس شہر کو آباد کرنا ہے جو دین سے بے بہرہ اور

برباد ہے۔ پس میں نے اس مسجد میں ڈیرا جمایا اور بازار، اوطاقوں میں جا کر لوگوں کو دین کی دعوت دینے لگا۔ انھیں آخرت سنوارنے کی رغبت دلاتا، غیرت ایمانی جگانے کے جتن کرتا۔ آہستہ آہستہ مسجد خوب آباد ہونے لگی۔ تب میں نے دینی شعور بیدار کرنے کے لیے یہاں مدرسہ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ جمعے کے دن خطبے میں میں نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے وقف کریں۔ یہی علم حقیقی و منفعت ہے۔ یہ نہ صرف آپ کے بچوں کو بلکہ آپ کو بھی، انھیں دینی تعلیم دلانے کی وجہ سے آخرت کے عذاب سے، جہنم کی بھڑکتی آگ سے نجات دلائے گا۔ میری بات پر لوگوں نے لبیک کہا اور بچوں کو تعلیم کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔ مگر یہ معاملہ صرف قاعدہ اور قرآن کی تعلیم تک رہا۔ اکثریت اسکولوں میں پڑھنے والی اور کھیتوں میں کام کرنے والی تھی، لہٰذا علم حدیث و علم فقہ کی ابتدا نہ ہو سکی۔ مسافر طلبا کی رہائش کی سہولت نہ تھی لہٰذا شہر کے نیک پرور لوگوں کو جمع کیا اور انھیں توجہ دلائی کہ اگر مسجد کے ساتھ ہی مدرسہ تعمیر ہو جائے تو مسافر طلبا آ کر دینی تعلیم حاصل کریں گے اور قرآن و حدیث کا درس سیکھیں گے۔ پھر جب تک مدرسہ قائم رہے گا اور درس و تدریس ہوتی رہے گی، آپ کی آخرت کے چھٹکارے کا ثمر جمع ہوتا رہے گا۔ فوراً ہی مدرسے کی عمارت کھڑی ہوئی اور میں دیہاتی علاقوں سے طلبا کے حصول کے لیے دورہ پر نکل کھڑا ہوا۔ ایک گاؤں سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں دیہاتی لوگ ویسے بھی روشن قلب ہوتے ہیں، تو اس دورے میں کئی بچے اسلام کے لیے وقف کیے گئے اور یہاں مدرسے میں زیر تعلیم ہوئے اور آج ان میں کئی الحمدللہ ملک کے مختلف حصوں میں بے دین لوگوں کو دین کے زیور سے آراستہ کر رہے ہیں۔ اس جگہ پر بڑے میاں جی توقف کرتے۔ مفتی سجاد حسین کا نام پکارتے جوان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوتا اور اسے کھڑے ہو جانے کا کہتے۔

''سب سے بڑی مثال جناب مفتی آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔'' وہ مفتی صاحب کو ہمیشہ جناب مفتی پکارتے تھے۔ ''یہ وہ بچہ تھا جس کا والد صوبیدار اور گاؤں کا چودھری تھا۔ اس بچے نے میری درد انگیز دینی باتیں سن کو خود کو دین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کا والد راضی نہیں تھا۔

ماں نے بھی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر ہزار آفرین اس بچے پر جس نے ماں باپ کو بھلا کر دین شریعت کو اختیار کیا۔ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آج یہ آپ کی شہر کی ظلمت کو اپنی نورانیت سے منور کر رہا ہے۔"

لوگوں میں سبحان اللہ کا شور اٹھتا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ مفتی صاحب سارے رشتے ناتے بھلا آئے تھے۔ گاؤں جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ عیدین تک جامعہ میں کرتے تھے۔ جب ماں کا دل بے تابی کی باڑیں پھلانگنے کو آتا تو وہ ملنے آجاتی۔ کچھ لمحے بیٹے کو دیکھ کر، کچھ باتیں بول کر روتی سسکتی واپس چلی جاتی۔ مفتی صاحب پر کچھ اثر نہ آتا۔ چند ایک مرتبہ ہی گاؤں گئے۔ والد صاحب کے وصال کے بعد کبھی کبھار ماں کے بلاوے پر چلے جاتے کہ اب ضعف اور بیٹے کی جدائی نے ماں کو سفر کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ والدہ کی جہاں سے رخصتی کے بعد وہ کبھی کبھار کا جانا بھی چھوٹ گیا۔

چھوٹا بھائی سکیلدھو یا اس کے بیٹے ملنے کو آتے اور گاؤں چلنے پر زور بھی دیتے مگر مفتی صاحب کا جواب ناکار میں ہی ہوتا تھا۔ کہتے، "بھائی، تمھیں پتا ہے وہاں کے ماحول کی وجہ سے میرا دل آنے کو نہیں کرتا۔ اور اللہ تمھیں یہاں ملنے کے لیے بھیج بھی دیتا ہے تو میں یہیں اچھا ہوں۔" علاوہ ازیں مفتی صاحب چونکہ نفس کشی پر سدا کاربند رہے تو اگر کبھی دل نے گاؤں جانے کی تمنا بھی کی تو اسے نفسانی خواہش قرار دے کر کچل ڈالا۔ انھوں نے جامعہ ہی کو گھر بنایا تھا اور دینی علوم پڑھنا پڑھانا مقصد حیات۔ بڑے میاں جی کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند روح الامین نے جب مسجد اور جامعہ کو سنبھالا تو مفتی صاحب کے درجہ عزت میں کوئی کمی نہ کی، بلکہ روح الامین خود مفتی صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے، لہٰذا اس نے مسجد کی امامت کا اعزاز بھی مفتی صاحب کو بخشا۔

مفتی صاحب نے خود کو مسجد کے ساتھ ساتھ لائبریری تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ اس لیے شہر بھر کے لوگ یا عام مولوی بھی فقہی مسائل کے حل یا فتویٰ کے پوچھنے کے لیے مفتی صاحب کے ہاں لائبریری میں حاضر ہوتے جہاں مفتی صاحب سارا دن میسر رہتے۔ خواتین بھی دینی معلومات یا خانگی جھگڑوں کے حل کی خاطر ان کے پاس بلا جھجک آتی رہتیں۔ روزمرہ کی زندگی مفتی صاحب کے اختیار

کیے ہوئے طریقے پر جاری تھی کہ زیب النسا نے آ کر ان کے معمولات میں خلل ڈال دیا اور مفتی صاحب کے خیالات اور رجحانات کے مرکز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

سویرے سویرے ابھی مفتی صاحب تسبیحات اور اشراق نماز پڑھ کر لائبریری میں داخل ہی ہوئے تھے کہ زیب النسا آ پہنچی۔ زیب النسا بہت ٹھسے کی عورت تھی۔ بیالیس، پینتالیس سال کی عمر میں بھی لمبے قد کے ساتھ بھرا بھرا جسم اور وہ بھی گٹھیلا۔ جب وہ مردوں طرح سینہ نکال کر چلتی تو گریبان کے بٹن ٹوٹنے کو آتے۔ محلے بھر کی عورتیں اسے اپنا امام مانتی تھیں۔ کسی نے خریداری کے لیے بازار جانا ہو، بچہ ڈاکٹر کو دکھانا ہو، رشتہ کرنے کے لیے مشورہ لینا ہو، سلائی کڑھائی کی کوئی ڈیزائن سمجھنی ہو، گھر میں کوئی دینی محفل کروانی ہو، سب کا رخ زیب النسا کی طرف ہوتا۔ اور وہ بھی بلا حیل وحجت ہر ایک کی مدد کے لیے تیار بیٹھی ہوتی۔ کچھ ماہ پہلے جب اس کے شوہر ماسٹر رمضان نے اسے طلاق دے دی تو محلے بھر پر سکتہ چھا گیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ اپنے شوہر اور بچوں سے محبت کرنے والی اور اتنی خدمت گذار مائی زیبن کو طلاق کیسے ملی؟ وہ تو بعد میں بھانڈا پھوٹا کہ ماسٹر رمضان گرلز اسکول کی ایک ماسٹرنی کے عشق میں باؤلا ہوا پھرتا تھا اور اس کی فرمائش پر اس نے گھر برباد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ بعد میں خاندان کے بڑوں، دوستوں اور محلے والوں کی لعنت ملامت اور اپنے جوان بچوں کے تیر آنکھوں نے اسے ہوش میں لایا تھا اور اب وہ مائی زیبن کے آگے پیچھے گڑگڑاتا اور معافیاں مانگتا رہتا تھا، مگر مائی زیبن کی موت جیسی گہری چپ ٹوٹنے میں نہ آتی تھی۔

مایوس ہونے کے بعد ماسٹر رمضان کو مفتی صاحب کی ذات میں امید کا چراغ نظر آیا۔ اسے یقین تھا کہ مائی زیبن اپنے والد سمیت کسی کی بات مانے یا نہ مانے مگر مفتی صاحب کی بات نہیں ٹالے گی۔ ماسٹر رمضان مائی زیبن کے مفتی صاحب سے روحانی تعلق سے بخوبی آگاہ تھا۔ ماسٹر رمضان نے مائی زیبن کے ساتھ وقت بتاتے ہوئے دیکھا تھا وہ مفتی صاحب کو جیسے اپنا مرشد مانتی تھی۔ اگر بھولے سے بھی کسی کی زبان سے مفتی صاحب کے لیے احترام بھرا لفظ نہ نکلا تو وہ سامنے والے سے لڑائی پہ تل جاتی۔ بارہا ماسٹر رمضان نے نظارہ کیا کہ مفتی صاحب کا کھانا لے جانے میں اس سے یا اس کے بیٹوں

میں سے کسی سے ذرا تاخیر ہوئی ہوتو مائی زیبن میں شدید درجے کی بے چینی ابھر آتی۔ ماسٹر رمضان سے تو ذرا سی رعایت ہو جاتی مگر اپنے دونوں بیٹوں کے وہ لتے لے ڈالتی۔ اسی امید کے پیش نظر ماسٹر رمضان نے مفتی صاحب کی لائبریری کی چوکھٹ جا پکڑی۔ مفتی صاحب نے پہلے تو اسے سخت سست کہا، جائز کاموں میں سے خدا تعالیٰ کا سب سے ناپسندیدہ کام کرنے پر اسے شرم دلائی اور انجام کار اسے مائی زیبن کے والدین سے رابطہ کرنے کو کہا۔ تب ماسٹر رمضان زاروقطار رو پڑا۔

''مفتی صاحب، میں سب حیلے بہانے آزما کر پھر یہاں آیا ہوں۔ آپ مجھے مایوس مت کریں۔''

''ماسٹر، توبہ، نعوذ باللہ! تمھیں فکر آخرت ہے یا نہیں؟ یعنی کہ میں مسمات زیب النسا کو کہلواؤں کہ وہ حلالہ کے لیے راضی ہو جائے؟ تمھیں علم ہے کہ شریعت میں موجودہ حلالہ کا تصور جو کہ مروج ہو گیا ہے، بالکل بھی نہیں ہے۔ شریعت نے یہ کہا ہے کہ ایک مطلقہ عورت تب اپنے طلاق دینے والے شوہر سے دوبارہ نکاح میں آسکتی ہے جب وہ کسی اور کے نکاح میں آجائے۔ اس بات سے یار لوگوں نے یہ جزی نکالی ہے کہ مطلقہ عورت کا نکاح اس بندے سے کرواتے ہیں جس سے شادی کی پہلی صبح پر طلاق دینے کا شرط کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ غلط نہیں مگر غلط رواج ضرور ہے۔ میں ایسا عاقبت نااندیش نہیں کہ ایسے کام کا حصہ بنوں۔'' مفتی صاحب کی اس بات کے بعد ماسٹر رمضان جیسے جی ہار بیٹھا۔ وہ مفتی صاحب کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''مفتی صاحب، میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا۔ میری خطا ہے۔ میں اس گناہ کی کب سے زیب النسا سے معافی مانگ رہا ہوں۔ مجھے میرے کیے کی بہت سزا مل چکی ہے۔ گناہ سے توبہ کرنے پر خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ آپ ہی زیب النسا سے میری خطا معاف کروا سکتے ہیں۔ کسی کے گھر بسانے کے لیے کوشش کرنا بھی تو کار ثواب ہے۔ اب بس آپ میرا سہارا ہیں۔ خدا کے لیے میری امداد کریں۔'' وہ روتا ہوا مفتی صاحب کے سامنے جھک گیا۔

''میاں، کفر نہ بکو۔ خدا ہی سب کا سہارا ہے اور اسی کا سہارا قائم و دائم ہے۔ تم جاؤ۔ میں

استخارہ کرتا ہوں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو تمھارے لیے سعی کی جائے گی۔'' اس جواب کے بعد ماسٹر رمضان کی کچھ ڈھارس بندھی اور وہ رخصت ہو گیا۔ مفتی صاحب کی اس خاندان سے دلی وابستگی بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس میں پڑنے والی دراڑیں دو کنارے بن جائیں۔ انھوں نے استخارہ کیا اور مثبت جواب آنے کے بعد انھوں نے مائی زیبن کو پیغام بھیجا: ''انسانی نفس شیطان کا ہمنوا ہے۔ انسان سے غلطیاں سرزد کروا دیتا ہے۔ آپ اگر ماسٹر رمضان کو معاف کر دیں اور اس کی دوبارہ گھر بسانے والی بات پر غور کریں تو بندہ ناچیز آپ کے لیے دعا گو رہے گا۔ میں نے استخارہ کیا ہے، اس میں بھی مثبت جواب آیا ہے۔'' مفتی صاحب کے اس پیغام ملنے کی پانچویں صبح زیب النسا لائبریری میں مفتی صاحب کی نشست گاہ پر ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مفتی صاحب نے زیب النسا کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا، ''وعلیکم السلام۔ آپ اتنی صبح صبح؟'' مفتی صاحب کو زیب النسا کی آمد کی وجہ کا اندازہ تو تھا مگر انھوں نے استفسار بہتر سمجھا۔

''مفتی صاحب، ماسٹر جی سے دوبارہ ناتا جوڑنے کے لیے جب آپ کا حکم آیا تو میں نے اسی وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر میرا اندر پتا نہیں کیوں مان ہی نہیں رہا تھا۔ میری اتنی ساری عمر کے رشتے کو ماسٹر نے چند لفظوں سے دو کوڑی کا کر دیا۔ میرے وجود کو نکاح کے ذریعے اس سے جوڑا گیا تھا۔ جب اس نے اس کی پاسداری نہ کی تو اب میں دوبارہ خود کو اس سے جڑنے پر کیسے آمادہ کر لوں؟ بس خود سے منواتے منواتے کچھ دن لگ گئے۔ میں تو اسی دن آپ کے پاس حاضر ہو کر ماننا چاہتی تھی مگر میں نے سوچا کہ اندر ابھی نہیں مان رہا تو ظاہر باہر سے کہہ کر میں مفتی صاحب سے منافقت کیسے کروں۔ اسی لیے کچھ دن دیر کی معافی چاہتی ہوں۔'' زیب النسا کے الفاظ سن کر مفتی صاحب کو محسوس ہوا جیسے ہر لفظ کورے گھڑے کی طرح کھنکتا اور مٹی کی طرح خالص ہو۔

''دراصل میں نے صرف اس لیے پیغام بھیجا کہ میں اس گھر کو اور مکینوں کو آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ اللہ میری نیت کو جانتا ہے۔''

''نہیں نہیں مفتی صاحب، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں آپ کی ذات کو جانتی ہوں۔''

زیب النسا یہ الفاظ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ مفتی صاحب زیب النسا کا اگلا جملہ سننے کے انتظار میں رہے۔ لائبریری کے بڑے سے ہال میں سناٹا پیدا ہوگیا اور گزرتے لمحوں کے ساتھ اس کی عمر بڑھنے لگی۔تب مفتی صاحب کے نظر زیب النسا کے چہرے پر گئی اور انھیں یوں لگا جیسے جھکڑوں بھرا زوردار طوفان ان کی طرف بھاگا چلا آرہا ہو۔تب زیب النسا بولنے لگی اور کمرے میں جامد سناٹا ریزہ ریزہ ہوگیا۔ ''مفتی صاحب، میں ماسٹر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کے لیے تیار ہوں۔بس میری ایک درخواست ہے کہ حلالہ کا نکاح مجھ سے آپ کریں گے۔'' زیب النسا کے ان الفاظ نے مفتی صاحب کے جڑوں کو ہلا ڈالا۔

''مائی صاحبہ، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں!'' مفتی صاحب بے اختیار اپنی نشست گاہ سے کھڑے ہوگئے۔

''مفتی صاحب، میں نے کوئی گناہ کا کام تو نہیں بولا، میں نے تو بس نکاح کا کہا ہے۔''

''مائی صاحبہ، میں نے زندگی بھر نکاح، عورت سے دور رہنے کا عہد کیا ہوا ہے۔میں کبھی بھی یہ کام نہیں کرسکتا۔آپ نے سوچا بھی کیسے؟''

''مفتی صاحب میں نے تو وہ بات کہی ہے جسے نبی نے اپنی سنت بتایا ہے۔ نبی کریم نے کہا ہے کہ اس دنیا میں میری تین پسندیدہ اشیا میں سے نماز، خوشبو اور عورت ہے۔'' مفتی صاحب کو یہ سنتے ہی چپ لگ گئی۔زیب النسا مفتی صاحب کو چپ دیکھ کر پھر بول پڑی۔ ''مفتی صاحب، آپ تو صاحب علم ہیں۔آپ تو لوگوں کو نبی کی راہ پر لگانے والے ہیں۔آپ کیسے بھول پڑے؟ نبی کی سنت، ان کی پسند سے دور ہوگئے؟'' زیب النسا کے لہجے میں وحشت تھی۔ مفتی صاحب کو یوں لگا جیسے ان کے وجود کے انیٹیں گرتی جارہی ہوں۔وہ خود کو سمٹتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ ''میں تو وہ کام کررہی ہوں جو حضرت خدیجہ نے کیا تھا۔میں تو ان کے نقش قدم پر آپ کو نکاح کا پیغام دے رہی ہوں۔'' آہستہ آہستہ اس کے لہجے میں بے خودی، بے ربطی اور وحشت انگیزی بڑھنے لگی۔ ''مفتی صاحب، میں تب سے آپ کو من میں بسائے ہوئے ہوں جب میں بارہ تیرہ سال کی عمر میں مسجد میں قرآن شریف

پڑھنے آتی تھی۔ پتا نہیں کیسے آپ کی تصویر میرے من میں چھپ گئی۔ میں نے اسے گناہ سمجھ کر مٹانے کی بڑی کوششیں کی ہیں مگر میں کامیاب نہ ہوئی۔ پوری عمر اسی کشمکش میں گزری۔ اب میں خود کو گناہگار نہیں سمجھتی۔ جس بات پر میرا بس ہی نہیں چلتا، میری قدرت ہی نہیں، میں اس معاملے میں گناہگار کیسے ہو سکتی ہوں؟ خدا جانتا ہے، جب میرے والدین نے ماسٹر رمضان سے میری شادی کی، میں اس کے کھونٹے سے بندھی رہی۔ میری تمام تر توجہ محبت، خوشیوں کا مرکز ماسٹر رہا۔ میں نے اس کو جی جان سے چاہا۔ مگر میں آپ کو نکال نہیں پائی۔ چاہنے کے باوجود میں ناکام رہی۔ میں نے خود کو بچوں میں، محلے والوں کے کام کاج میں مصروف رکھ کر بھی کوشش کی مگر خدا کے راز خدا ہی جانتا ہے۔ اب اس جاتی عمر میں اگر قسمت نے یہ موقع دیا ہے تو میں اسے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ آپ خدا کے لیے مجھ سے نکاح کرلیں۔ چاہے ایک رات کے لیے سہی، مگر میں آپ کے نکاح میں آنا چاہتی ہوں۔'' بات کے اختتام پر زیب النسا کا چہرہ آنسوؤں نے گھیر رکھا تھا۔ مفتی صاحب نے وجود میں کمزوری پھیلتی محسوس کی۔ خود کو کھڑے ہونے کے قابل نہ پا کر نشست گاہ پر ڈھے گئے۔

''مائی صاحبہ، میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔''

''مجھے نہیں چاہیے عزت۔ نہیں چاہیے احترام۔ اگر آپ نے دینا ہے تو وہ دیں جو میں چاہتی ہوں۔ اور شریعت بھی مجھے اس کی اجازت دیتی ہے۔'' وہ بپھر گئی۔ ''آپ شادی نہ کر کے کوئی نیکی کا کام نہیں کر رہے، بلکہ آپ سوچنے لگیں تو آپ گناہگار بن رہے ہیں۔'' اس بات کے اختتام پر پھر عاجزانہ انداز اور آنسو لوٹ آئے۔ ''مفتی صاحب، خدا رسول کے لیے مجھے قبول کرلیں۔''

''مجھے معاف کیجئے گا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔'' مفتی صاحب کے پاس بجز ان لفظوں کے کوئی جواب نہیں تھا۔

''آپ یہ کریں یا نہ کریں، لیکن یاد رکھیے گا آپ خود کو شادی سے دور رکھ کر کوئی نیکی کا کام نہیں کر رہے بلکہ گناہ در گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔'' زیب النسا ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ''میں جا رہی ہوں لیکن پھر آؤں گی، اور آپ کو یہ کرنا پڑے گا۔''

وہ جملے کے اختتام تک تیز تیز قدم اٹھاتی لائبریری سے نکل چکی تھی۔ زیب النسا کے جانے کے بعد لائبریری میں خاموشی اتری اور مفتی صاحب کے وجود پر بھی چھانے لگی۔ اس کے اثرات مفتی صاحب کے اندر تک پہنچنے لگے۔ مفتی صاحب نے برداشت کرنے کے لیے زور لگایا مگر خود کو بے بس پا کر اٹھے اور نوافل کی ادائیگی میں لگ گئے۔ طلبا جب کتب احادیث اٹھا کر درس لینے کو پہنچے تو مفتی صاحب نوافل میں مشغول تھے۔ سبق پڑھاتے ہوئے آج ان کی یکسوئی مفقود تھی۔ حدیث کی عبارت پڑھتے ہوئے زیب النسا کے الفاظ ذہن میں آتے تھے۔ بار بار ''لاحول ولا'' پڑھ کر ذہن کو عبارت اور معنیٰ میں لگانے کی کوشش کرتے تھے مگر خیالات ان کے قابو میں نہ آتے۔ دو اسباق سے زیادہ پڑھا نہ پائے۔ اٹھ کر اپنی اقامت گاہ میں چلے گئے۔ تین تسبیحیں پڑھنے کے بعد ذرا جی ہلکا ہوتا محسوس کیا۔ چار دن کے بعد جب جمعے کی صبح مفتی صاحب ڈاڑھی کو مہندی لگانے کی تیاری میں تھے تو زیب النسا پھر نازل ہوگئی۔ زیب النسا پر نظر کیا پڑی مفتی صاحب کو محنت سے پیدا کی ہوئی طمانیت رخصت ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ پریشان خیالی میں آگئے۔

زیب النسا بنا کچھ کہے مفتی صاحب کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ یوں تھا جیسے اس پر مرگ واقع ہو چکا ہو۔ ہمیشہ سے اس کا اٹھا ہوا چہرہ آج اٹھتا نہ تھا۔ ٹھسا غائب اور آنکھیں بے روح تھیں۔ مفتی صاحب کو کبھی کوئی میت بھی اس قدر زرد نہ دکھائی دی تھی۔ مفتی صاحب زیب النسا کی مرگ صورت کو وقفے وقفے سے اپنی گری ہوئی آنکھیں اٹھا کر دیکھتے رہے مگر وہ چپ سادھے آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ تادیر جب مفتی صاحب محسوس کرنے لگے کہ اتنا زمانہ بیت چکا ہے گویا قیامت کا اذن آنے والا ہے۔ زیب النسا نے آنکھیں کھول کر مفتی صاحب کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ ان نگاہوں کی گہرائی بڑھتی گئی۔ مفتی صاحب کو یوں محسوس ہونے لگا وہ نظریں ان کے گوشت، رگوں اور ہڈیوں کو چیرنے لگی ہیں۔ تب زیب النسا اٹھی اور ''میں پھر آؤں گی،'' کہہ کر چلتی گئی۔

زیب النسا کے جاتے ہی مفتی صاحب کا جسم جھرجھرایا اور ان کی کمر کمان کی طرح تن جانے کے بعد پیچھے پڑے تکیے پر جا پڑی۔ اس دن مفتی صاحب بہت کچھ بھول گئے۔ مہندی لگانا

بھولے۔زوال کے بعد صلوٰۃ تسبیح پڑھنا بھولے۔ جمعہ نماز پڑھاتے ہوئے بھولے۔انھیں صرف زیب النسا کی اٹھنے سے پہلے والے لمحوں کی برمے کی طرح سوراخ بناتی آنکھیں یاد رہیں۔ زات کو بے چینی بلاتی رہی اور نیند کے کچھ پل ہی ان کے ہاتھ آئے۔اگلی صبح کو جب وہ شل دماغ کے ساتھ مفلوج بنے بیٹھے تھے تو زیب النسا پھر آن پہنچی۔ آج مفتی صاحب اس کی زبان حال کی شدت سہار سکے۔چیخ پڑے:

''مائی صاحبہ، آپ کیوں میرے ایمان کے درپے ہوگئی ہیں؟ جب میں بتا چکا ہوں کہ میں یہ نہیں کرسکتا، آپ سے نکاح نہیں کرسکتا، تو آپ کیوں روز روز آ کر میرے سکون میں خلل ڈالتی ہیں؟''
تب زیب النسا کی کنویں سے آتی آواز ابھرنے لگی:

''مفتی صاحب، آپ نے تو سالوں سے میری حیاتی میں خلل ڈالا ہوا ہے۔ مگر میں نے تو اس کو کبھی آپ کا قصور نہیں سمجھا۔ یہ تو رنگی رب کے رنگ ہیں۔ شکوے کرنے ہیں تو اس سے کریں۔ میں بھی اس سے کرتی ہوں۔ اس نے میرے دل کو بدل دیا تو میں کیا کروں؟ میں نے تو بہت کوششیں کی چھٹکارے کی۔''

''مائی صاحبہ، یہ نفس کی چال ہے۔ آپ شیطان کے ورغلانے میں نہ آئیں۔'' مفتی صاحب نے اتنا کہا تھا کہ زیب النسا پہلے دن کے روپ میں آگئی۔

''مفتی صاحب، آپ نے کیا دین پڑھا ہے جو نبی کی سنت کو شیطان کا ورغلانا اور نفس کی چال کہتے ہیں؟'' زیب النسا کے گرجتے الفاظ مفتی صاحب پر کوڑے کی طرح پڑے۔ ''استغفار کریں ایسے الفاظ پر!'' زیب النسا کے الفاظ سن کر مفتی صاحب کے فکر کے زنگ آلود کواڑ جیسے دھڑام سے جا گرے۔ ان کا دل صدق سے استغفار کرنے لگا۔

''مائی صاحبہ، خدارا آپ مجھے بخش دیں۔ میں آپ کو ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' مفتی صاحب کی بے بسی انتہا تک جا پہنچی تھی۔ یہ جملہ کہہ کر وہ تیر کی طرح لائبریری سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ ''مفتی صاحب، میں پھر آؤں گی۔'' زیب النسا کا جملہ تعاقب کرتا ان تک پہنچا۔ مفتی صاحب کا

وجود جھگڑوں کی زد میں تھا۔ اپنی اقامت گاہ کے فرش پر لیٹے انھیں چین نہ آتا تھا۔ وقفے وقفے سے زیب النسا کا جملہ ''مفتی صاحب آپ نے کیا دین پڑھا ہے جو نبی کی سنت کو شیطان کا ورغلانا اور نفس کی چال کہتے ہیں؟'' ان کے دماغ میں کسی توپ کے دھماکے کی طرح گونجتا تھا۔ انھوں نے خواہشوں کے ترک کرنے کو جو اسلام کا جز بنا رکھا تھا اس فکر کی سد سکندری کی طرح موٹی دیوار آج زلزلے کی زد میں تھی۔ وہ پوری کی پوری لرزتی گرتی جا رہی تھی۔ مفتی صاحب کو سمجھ نہ آتی تھی کہ ان سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی؟ انھوں نے کیوں نفس کشی کو ہی نیکی و تقویٰ کا معیار بنا لیا؟ انھیں یاد آیا کہ نبی کریم نے کہا تھا اسلام میں رہبانیت نہیں۔ پھر حدید سورۃ کی آیت بھی آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''رہبانیت ان لوگوں نے خود شروع کی۔ ہم نے ان پر لازم نہیں کی تھی۔'' مفتی صاحب کو اپنی جہالت پر رونے کی سوا کوئی راہ نظر نہ آئی۔ وہ عمر بھر کولھو کے بیل کی طرح آنکھوں پر کھوپے چڑھائے خود کو پیٹتے رہے۔ وہ روتے ہی رہے۔ دل و دماغ ماتم میں مصروف تھے۔ اس دن تدریس پر بھی نہیں گئے۔ اندر کا مفتی انھیں گناہگار ٹھہراتا، تفسیر و حدیث کے پڑھانے کا قابل نہیں مانتا تھا۔

تب قاری نورالحسن ان کے پاس چلے آئے۔ وہ مفتی صاحب کے دوست اور جامعہ میں شعبۂ حفظ سنبھالتے تھے۔ دو بیویوں اور گیارہ بچوں کے باپ قاری نورالحسن درمیانہ سے ذرا کم قد رکھتے تھے۔ ہلکی پھلکی جسامت۔ چہرے پر شرعی ڈاڑھی۔ تسبیح پھرولتے ہوئے قاری صاحب مفتی سجاد حسین کی اقامت گاہ میں داخل ہوئے۔ مفتی صاحب مصلے پر دوزانو قبلہ رخ ہچکیوں میں تھے۔ نورالحسن ٹھہر گئے کہ مفتی صاحب دعا سے فارغ ہو لیں۔ مگر دعا اور ہچکیاں لمبی ہوتی رہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر قاری نورالحسن نے بلند آواز سے مفتی صاحب کو پکارا۔ مفتی صاحب کو اندازہ ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ کچھ لمحوں تک وہ آنکھیں بند کیے ضبط کرتے رہے۔ پھر مصلے سے اٹھے۔ قاری نورالحسن نے ان کے چہرے پر گریہ کے واضح آثار دیکھے۔ ''کیا بات ہے مفتی صاحب، آج آپ تدریس کے لیے بھی تشریف نہیں لائے؟ کوئی پریشانی لاحق ہے؟''

قاری نورالحسن کے استفہام کے باوجود مفتی صاحب ان کو ابھی واقعات سے آگاہ نہیں کرنا

چاہتے تھے۔ مگر پچھلے دنوں سے ان کے اندر میں جو تلاطم تھا اس کی کیفیت اتنی اذیت خیز تھی کہ وہ زبان پر قابو کھو بیٹھے اور انھوں نے ماسٹر رمضان کی آمد سے لے کر زیب النسا کے شدت بھرے تقاضے اور اس کی بار بار آمد کا تذکرہ کر دیا۔ بات کے اختتام تک قاری نورالحسن کی گھنی بھنویں آپس میں جا ملی تھیں اور خشونت سے پیشانی بھر آئی تھی۔

''مفتی صاحب، یہ آپ پر شیطان کا حملہ ہے۔ وہ آپ کی عمر بھر کی کمائی تباہ کرنا چاہتی ہے۔ چھوڑیں اس کو۔ اس بات سے دور بھاگیں۔''

''قاری صاحب، میں خود اس سے بھاگ رہا ہوں۔ لیکن مائی زیب النسا میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میری جان ہی نہیں چھوڑتی۔'' بات ختم کی تو مفتی صاحب کو ایسے لگا جیسے ایسا کہہ کر انھوں نے غلطی کر دی ہو۔

''مفتی صاحب، وہ تو ہے ہی ایک فاحشہ عورت۔ بدذات! کیسی بے حیائی سے خود کو پیش کر رہی ہے۔ آپ نے کبھی دیکھا سنا کہ کسی عورت نے خود کو بے حیاؤں کی طرح جا کے پیش کیا ہو؟ کوئی پاکباز عورت ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ کسبی عورتوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے۔۔'' قاری نورالحسن کا غضب ناک لہجہ تھوکیں اڑا رہا تھا۔ مفتی صاحب کے سامنے زیب النسا کی صورت شکوہ سے آ کھڑی ہوئی۔ ''مفتی صاحب، یہ آپ نے بھرے بازار میں میری چادر کو تار تار کر کے رسوائی میں ڈبو دیا۔ میری سالوں کی اطاعت، نیکی، پاکیزگی یوں ایک لمحے میں ملیامیٹ ہو گئی۔'' تب مفتی صاحب بول پڑے:

''قاری صاحب، کچھ دھیان کریں۔ کسی نیک عورت پر ایسے الزام آپ پر زیب نہیں دیتے۔ اور حضرت خدیجہؓ نے بھی رسول اللہ کو دعوت نکاح بھیجی تھی۔ آپ الفاظ کے انتخاب میں محتاط رہیں۔''

''استغفراللہ! استغفراللہ!'' قاری نورالحسن اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ''ایسی پاک ہستی سے آپ ایک بدکردار کو تشبیہ دے رہے ہیں! توبہ کریں مفتی صاحب، توبہ کریں۔ آپ یہ کیا کہہ رہے

ہیں؟ اس بدذات کو تو شوہر نے بھی طلاق دے رکھی ہے۔ اگر اتنی پاک پوتر ہوتی تو طلاق کیوں ملتی اسے؟ آپ خدا سے معافی مانگیں اور اس عورت سے دور ہو جائیں ورنہ آپ کا دین ایمان لے جائے گی۔'' قاری نورالحسن ناراض ناراض سلام کیے بغیر چلے گئے۔

دن مفتی صاحب کے لیے دشوار ہوتے چلے گئے۔ ان کی سوچیں دائرے میں سفر کرتی رہتیں۔ نکلنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ بے چینی جسم کے اردگرد ہی پھرا کرتی، کوشش کے باوجود دور نہ جاتی تھی۔ عبادت میں یکسوئی ختم ہوگئی۔ تدریس میں دھیان نہ لگتا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب مفتی صاحب سے نمازیں پڑھاتے سہو سرزد ہونے کی کثرت ہونے لگی۔ ہفتے ایک بعد زیب النسا نے لائبریری میں پاؤں رکھا تو مفتی صاحب نتیجے تک پہنچ چکے تھے۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے جہالت سے نکال لیا۔ مجھے خود پر شرمندگی ہے کہ میں اندھیرے کو روشنی مانتا رہا۔ میں عمر بھر رہبانیت کی سوچیں خود پر سوار کیے یہ سمجھتا رہا کہ یہی دین کی اصل روح ہے۔ میں نکاح سے دور رہ کر فخر کرتا رہا کہ میں نیکی، تقویٰ کا صاحب ہوں۔ مجھے پتا ہی نہیں لگا کہ میں تارک سنت بن گیا ہوں۔ مجھے خود پر شرمندگی ہے۔ بہت شرمندگی۔'' مفتی صاحب آج بولتے ہی جارہے تھے۔ ''مگر میں یہ عرض کروں کہ میں حلالہ کا نکاح کرنے سے معذور ہوں۔ یہ شرع میں پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ میں نکاح کروں گا۔ نبی کی سنت کی تابعداری کروں گا، لیکن میں آپ سے حلالہ کا نکاح کرنے سے معذور ہوں۔''

''مفتی صاحب، میری تو یہ آرزو ہے کہ میں روز محشر آپ کی منکوحہ بن کر اٹھائی جاؤں۔ میں آپ کے نکاح میں مرنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے آپ عقد کرلیں۔ میں حلالہ کا نکاح نہیں چاہتی۔'' زیب النسا کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

''آپ کا گھر اور بچے ہیں۔ آپ کا شوہر آپ سے محبت رکھتا ہے۔ وہ دوبارہ گھر کو آباد کرنا چاہتا ہے۔ میں اس گھر کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔''

''میرا کون سا گھر ہے مفتی صاحب؟ کیا کسی عورت کا گھر بھی ہوتا ہے؟ وہ تو دوسروں کے در

پر گزارہ کرتی ہے۔ باپ کا گھر کچھ اس کا اپنا ہوتا ہے، جو اس کے جانے کے بعد بھائی کا بن جاتا ہے۔ بھلا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی عورت باپ کے جانے کے بعد اس گھر کی مالکہ ہوئی ہو؟ اور شادی کے بعد تو وہ شوہر کے رحم و کرم پر گزارتی ہے جو کسی بھی لمحے لات مار کر اسے گھر سے نکال سکتا ہے۔ اور پھر شوہر کے گھر کے مالک بھی بیٹے بن جاتے ہیں۔ گھر کا عورت سے کیا کام مفتی صاحب؟ میرا کوئی گھر نہیں۔ اس لیے آپ اس بات کی فکر چھوڑ دیں۔'' زیب النسا کی باتوں سے عورت کی بے گھری نمایاں تھی۔

''مگر لوگ تو یہی کہیں گے کہ مفتی نے ماسٹر رمضان کا گھر اجاڑ دیا۔''

''مفتی صاحب، لوگ تو خدا اور رسول کے بارے میں بھی کہتے رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی بات نہ کریں۔'' زیب النسا یہ بات کہنے کے بعد مفتی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھنے لگی۔ مفتی صاحب نے جواب سے خود کو معذور پایا۔

''میں روح الامین صاحب سے مشورہ کے بعد آپ کو بتا سکوں گا۔ فی الوقت میں کچھ کہنے کی راہ نہیں پا رہا۔''

اس واقعے کے چوتھے دن جب مفتی صاحب پراگندہ خیالی سے عاجز ہو گئے، دماغ سوچوں کا انبار اٹھانے سے قاصر ہو گیا، تب اس دن نمازِ عصر کے بعد مفتی صاحب نے روح الامین سے تخلیے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''آپ کے والد گرامی مرحوم حضرت کے مجھ پر صدہا احسانات ہیں کہ انھوں نے مجھے راہ دکھائی اور حیوان سے انسان بنایا۔ خدا انھیں اپنے مقربین کے قرب و جوار میں جگہ عنایت کرے۔ بے شک وہ اسلام کے داعی، مصلح اور کامل شخص تھے۔ ان کی مجھ پر بے پایاں عنایات رہیں کہ انھوں نے میرے سر پر ہمیشہ اپنا دستِ شفقت رکھا، حالانکہ اس کا نہ میں اہل تھا نہ حقدار۔ ان کی رحلت کے بعد جس طرح نوجوانی میں آپ کے کندھوں پر بارِ ذمہ داری و منصب آیا آپ نے اسے بطریق احسن نبھایا ہے۔ یقیناً آپ کے والد گرامی کی روح کو اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہوگا۔ اللہ آپ کی عزت و مرتبے میں اضافہ کرے میں ایک ذاتی مسئلے میں آپ سے رہنمائی چاہتا

ہوں۔'' مفتی صاحب یہ بات کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''حضرت، میں تو صرف کوشش کرتا ہوں۔ اللہ قبول فرمائے۔ آپ حکم فرمائیں۔''

''ماسٹر رمضان اور اس کی بیوی کی علیحد گی کا تو آپ کو علم ہے۔ اب زیب النسا خاتون مجھ سے نکاح کرنے کی خواہش مند ہیں۔ آپ مجھے مشورہ دیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ اور آپ کا مشورہ میرے لیے محترم ہیں۔''

مولانا روح الامین مفتی صاحب کی بات سن کر اچنبھے میں آ گئے۔ ''حضرت، آپ کی پاکبازی نیکی اور تقویٰ کی لوگ قسم کھاتے ہیں۔ آپ اتنی بزرگ ہستی ہیں۔ اگر آپ نے زیب النسا سے عقد کیا تو کل کلاں لوگ زہر اگلتے پھریں گے، صرف آپ کی ذات پر نہیں بلکہ اس دینی ادارے کو بھی نشانہ بنایا جائے گا۔ لوگ تو ویسے ہی دین سے دوری کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اور اگر انھیں یہ بات ہاتھ آ گئی تو دعوت و تبلیغ کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ بالخصوص ہمارا مخالف پیر برکت علی ہر جگہ ہر محفل میں ٹھٹھے اڑاتا پھرے گا۔''

''مگر میں تو سنت نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی غیر شرعی عمل تو نہیں کرنا چاہتا۔'' مفتی صاحب نے کمزور لہجے میں مدافعت کی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر حالات اور معاشرے کو بھی دیکھ کر چلنا پڑے گا، ورنہ والد گرامی کی محنت اکارت چلی جائے گی۔ چونکہ آپ کی ذات اور ادارہ الگ الگ نہیں ہیں، اس لیے میرے نزدیک یہ بات مناسب نہیں۔ باقی آپ کے عقد کا خیال صائب اور مناسب ہے۔ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر یہ سنت جلد پوری کی جائے گی۔ میں خود بھی اس بارے میں کوشش کر لیتا ہوں۔''

مولانا روح الامین کی اس بات کے بعد گفتگو کی گنجائش نہ رہی تھی۔ مفتی صاحب کو ان کی باتوں میں وزن بھی نظر آیا، لہٰذا وہ کہہ کر اٹھ پڑے، ''بہت بہتر مشورہ ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا ہے۔ یہی ٹھیک رہے گا کہ عقد کے لیے کوئی اور رشتہ دیکھا جائے۔''

مفتی صاحب کی بات کے بعد روح الامین نے بھی راحت محسوس کی۔ ''آپ بے فکر رہیں۔

لوگ تو نیک رشتوں کی تلاش میں پریشان رہتے ہیں۔ جلد ہی کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ کر آپ کو اطلاع کروں گا۔''

مفتی صاحب کو اب زیب النسا کو جواب دینے کا مشکل مرحلہ عبور کرنا تھا۔ مگر روح الامین کی باتوں کے بعد وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے کسی فعل کی وجہ سے ادارے پر ایسا وقت آئے جس میں ان پر اتہام آئے یا دین کو بدنام کیا جائے۔ چند ایک دن کے بعد انھوں نے زیب النسا کو پیغام بھیجا۔ زیب النسا گویا اڑتی آ پہنچی۔ ''مائی صاحبہ، میرا خاندان دنیا دار اور ظاہر پرست تھا۔ عزیز رشتہ داروں بشمول والد صاحب کا دین ایمان سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ بلکہ میں یہاں تک کہوں کہ وہ صرف کلمہ گو تھے اور روایات کو ایمان کا درجہ دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ فاضلی مرحوم کو اللہ غریق رحمت کرے انھوں نے مجھے روشن راہ دکھائی۔ شرعی علوم سے آراستہ کیا ورنہ میں بھی آج بھنگ افیون کا چسیارا ہوتا اور سؤروں کتوں کی لڑائیاں کرواتا ہوتا۔ مرحوم حضرت عبداللہ نے مجھے دینی کام میں اپنا شریک کیا اور جامعہ ہٰذا میں اہم ذمہ داریاں سونپیں۔ میری جو بھی عزت و حیثیت ہے وہ اس ادارے کی وجہ سے ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ادارے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی ہو۔ میں اگر آپ سے عقد کرتا ہوں تو مخالفین کو ایک ذریعہ ہاتھ لگ جائے گا جس کے بعد وہ اس ادارے کو بدنام کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے میں خود کو معذور سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی مجھے معذور سمجھیں گی۔''

مفتی صاحب نے بات ختم کی تو زیب النسا کو یوں لگا کہ جیسے اس کی رگوں شریانوں میں دوڑتا خون منجمد ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے دماغ میں گھپ اندھیرا پھیلتا محسوس کیا۔ چاروں طرف روشنیاں خستہ اور کمزور ہو کر رہ گئیں۔ ''مگر مفتی صاحب... '' زیب النسا نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ مفتی صاحب نے اس کی بات قطع کر کے قطعی لہجے میں مخاطب ہوے۔ ''دیکھیے، آپ میرے نزدیک بہت معتبر ہیں۔ مگر ادارے کے تقدس و عظمت پر کچھ گوارا نہیں کر سکتا۔ اور میری ذات کی وجہ سے دین پر کوئی حرف آئے میں اس سے پہلے مرنا پسند کروں گا۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ مجھے

معذور سمجھیں۔'' مفتی صاحب نے زیب النسا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''نہیں مفتی صاحب، نہیں! خدا کے لیے نہیں!'' زیب النسا نے مفتی صاحب کے جڑے ہاتھوں کو بے اختیار تھام کر کھولتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اتنا ذلیل نہ کریں کہ میں زندہ ہی رہ نہ پاؤں۔ بس جیسے آپ کی مرضی۔'' زیب النسا ابھی اس کے چہرے پر مقتل گاہ کی طرف جاتے ہوئے سزائے موت کے قیدی کی طرح ناامیدی واضح تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے چلتی اوجھل ہوگئی۔

مفتی صاحب نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر اپنے اندر اذیت کی لہر جسم میں چمکتی بجلی کی طرح پھیلتی محسوس کی۔ زیب النسا کے لوٹ جانے کے بعد مفتی صاحب پر بے کلی ہر وقت سوار رہنے لگی۔ وقت بے وقت زیب النسا کی یاد آجاتی اور دل سے ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ انھیں زیب النسا کو چھوڑ دینا غلط محسوس ہونے لگتا۔ پھر دماغ تسلی دینے لگتا اور ان کے فیصلے کے نتائج سے آگاہ کرتا مگر دل دماغ پر حاوی ہوتے ہوئے بغاوت کا علم بلند کرنے لگتا۔ راتوں کی نیند روٹھی ہی رہتی اور انھیں تنہائی گلا گھونٹ کر مارنے کو آجاتی۔ اس صورتحال سے نجات کا ایک ہی راستہ انھیں سوجھتا کہ جلد عقد کرلیا جائے۔ مجبور ہو کر مولانا روح الامین کے پاس جا پہنچے۔ ''میں بے وقت تکلیف پر شرمندہ ہوں مگر کافی دن بیت چکے تھے۔ میں نے سوچا ملاقات کے ساتھ آپ سے اس عاجز کے عقد کے متعلق دریافت کرلیا جائے۔ اس لیے حاضر ہوگیا۔''

''قبلہ، آپ کی مہربانی کی آپ نے شرف زیارت بخشا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ مناسب رشتہ مل سکے۔ ایک دو احباب سے بھی کہا ہے۔ جیسے ہی کوئی ایسی مثبت بات ہوگی، میں خود عرض کروں گا۔'' مولانا روح الامین کی بات سے مفتی صاحب کو تسلی نہ ہو پائی مگر شرما حضوری سے واپس ہوگئے۔ بے چینی تھی کہ انتہا کو چھوتی رہتی۔ چین کا کہیں نام نہ تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے تو غلطیاں ہوتی ہی رہتیں مگر اب تدریس و عبادات بھی چھوٹنے لگی تھیں۔ مفتی صاحب خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہتے مگر قوت ضبط ان کے اختیار سے نکلتی جا رہی تھی۔ دو دن کے بعد مفتی صاحب خود کو روکتے روکتے پھر مولانا روح الامین کے پاس جا نکلے۔ ''مولانا صاحب، میرے معاملے میں کچھ پیش رفت

ہوئی؟'' روح الامین تب تک اپنے تئیں اچھی خاصی کوشش کر چکا تھا مگر صورتحال مایوس کن تھی۔ بھلا مفتی صاحب کی پچاس پچپن کی عمر۔ نہ اپنا گھر نہ ہی کوئی بہتر معاشی حالت۔ ایسے میں جن سے بھی بات کی گئی ان سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا تھا۔ روح الامین مفتی صاحب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''حضرت، کوشش کر رہے ہیں۔ انشاءاللہ کوئی تدبیر نکل آئے گی۔''

مفتی صاحب کے جانے کے بعد مولانا روح الامین نے قاری نورالحسن کو مشاورت کے لیے بلالیا۔ ''قاری صاحب حضرت مفتی صاحب عقد مسنونہ کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کے رشتے کے لیے جن سے بھی بات کی ہے وہ مفتی صاحب کی بڑی عمر اور گھر گھاٹ نہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ کوئی مثبت جواب نہیں مل رہا۔ میں پریشان ہوں کہ مفتی صاحب کے معاملے کو کیسے حل کیا جائے؟''

''آپ پریشانی نہ لیں۔ مفتی صاحب کو اس عمر میں اب اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ نجانے انھیں کیا ہوگیا ہے کہ اب دنیا میں گھر بسانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تو انھیں اخروی دائمی گھر کی توجہ کرنی چاہیے۔ آپ ہی انصاف کریں، کوئی اپنی بچی کا مستقبل خراب کرے گا؟''

''قاری صاحب، کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہیں مگر جب مفتی صاحب مجھ سے معلوم کرنے آئیں تو میں کیا جواب دوں؟ میرے تو وہ محترم اور استاد بھی ہیں۔''

"جناب، آپ دلاسا دیتے رہیں۔ یہ شادی کا بھوت کچھ ہی عرصے میں اتر جائے گا۔'' قاری نورالحسن کی بات مولانا روح الامین کو بھی ایک حل دے گئی۔ جب پھر مفتی صاحب مولانا روح الامین کے پاس آئے تو انھوں نے قاری نورالحسن کی بات ذہن میں لاتے ہوئے انھیں دلاسا دے دیا۔ ''جی حضرت، کچھ رشتے ہیں۔ میں جلد آپ کو آگاہ کردوں گا۔'' مگر یہ جلد نہ آنا تھا نہ آیا۔ دن گزرتے گئے۔ مفتی صاحب صبر حوصلہ ہارتے گئے۔۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ مفتی صاحب آنے جانے والے اور عام ملاقاتیوں سے بھی اپنی شادی کے لیے رشتہ دیکھنے کا تقاضا کرنے لگے۔ لوگوں کے اندر مفتی صاحب کی پرتقدس شخصیت کا پرتو آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ لوگ جہاں بھی مفتی صاحب کو دیکھتے، آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کرتے۔ طلبا کو جس دن مشکل سبق درپیش ہوتا وہ مفتی صاحب کے

رشتے کی بات نکال لاتے اور پھر سارا وقت مفتی صاحب کے لیے رشتے دیکھے جاتے۔ بحث ومباحثہ ہوتا، شریر طلبا تو طنز بھی کر دیتے، مگر مفتی صاحب طنز وطعنوں سے بے خبر اپنی دنیا میں مست رہتے۔ نماز کے دوران غلطیاں ہونے کی کثرت ہوگئی۔ پہلے جو لوگ مفتی صاحب کے ادب میں زبان دانتوں تلے رکھتے تھے اب ان کی زبانیں گز بھر لمبی ہوگئیں تھیں۔ خصوصاً حاجی نزاکت پیٹھ پیچھے تو چھوڑیے سامنے بھی کبھی گستاخی بھرا جملہ نکال دیتا۔ خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ بعض منچلوں نے مفتی صاحب کی دل میں یہ بات ڈال دی کہ شوکت تاجر، رانا جلال الدین، ذاکر اللہ خان اور قاری نور الحسن کے گھروں میں جوان بیٹیاں موجود ہیں، مگر وہ ان کا رشتہ کروانے میں تساہل برت رہے ہیں، اور یہ کہ مولانا روح الامین نے تو رانا صلاح الدین اور قاری نور الحسن کو مفتی صاحب کے رشتے کے لیے کہا بھی مگر انھوں نے صاف جواب دے دیا۔

مفتی صاحب جونہی جمعے کے خطبے کے لیے منبر پر بیٹھے، انھوں نے بیٹیاں گھر بٹھا کے ان کے رشتے نہ کروانے والوں کی خوب مذمت کی اور ایسے افراد کو نارِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔ دورانِ خطابت انھوں نے صرف نام لینے سے گریز کیا، باقی ایسے افراد کی طرف واضح اشارے کیے جنھیں ہر ایک سمجھ سکتا تھا۔ مزید انھوں نے صالح بندوں کے رشتے ٹھکرانے والوں کو بھی وعید سے نوازا۔ رانا صلاح الدین، شوکت تاجر، دوران تقریر بل کھاتے رہے۔ ذاکر اللہ خان تو اٹھ کر لڑائی لینا چاہتا تھا مگر قاری نور الحسن نے اسے روکے رکھا۔ جمعے کے بعد غصے سے بھرے یہ افراد مولانا روح الامین کے پاس جا پہنچے۔

''مولانا صاحب، ہم مسجد ومدرسے کی قدیمی زمانہ سے خدمت کر رہے ہیں۔ ہم یہاں دین حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ مفتی صاحب کی باتیں آج آپ نے بھی سن لیں۔ اس نے سر بازار ہماری پگڑیاں اچھالی ہیں۔ اس نے یہ تک کہا کہ مسجد کے پڑوس میں آباد زمیندار اپنی چار بیٹیوں کے رشتے نہیں کرتا اور اپنی ذات برادری کے باہر رشتہ کرنے کو بے غیرتی سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ سن لیں کہ نبی آخر الزماں ذات پات رنگ ونسل کو ختم کرنے آئے تھے۔ یہ بات ہے جمعے کے خطبے میں کرنے

کی؟ یہ ہے مفتی آپ کا جو مسجد میں بیٹھ کر ہمیں ذلیل کرتا ہے؟ اگر اس کو آپ نے امامت وخطابت سے نہ ہٹایا تو میرا اس مسجد میں پاؤں رکھنا حرام ہے۔۔'' رانا صلاح الدین نے بات ختم کی تو ذاکر اللہ خان شروع ہو گیا۔''مولانا صاحب، یہ مفتی ہماری بچیوں پر خراب نظر رکھتا ہے۔ خدا کی قسم ہم نے اسے اس کی ڈاڑھی کی وجہ سے بخش دیا، ورنہ گولی مارنے کو دل کرتا ہے۔ آپ اس کا بندوبست کرو۔''

مولانا روح الامین ان کے چہروں کے بگڑے زاویے اور بدلتے لہجوں سے پریشان ہو گئے۔ یہ لوگ مخیر ین کی صف اول میں سے تھے لہٰذا روح الامین کو فیصلہ کرنے میں دقت پیش نہ آئی۔ ''آپ سے معذرت کرتا ہوں کہ آپ نیک دوستوں کو ذہنی اور روحانی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مفتی صاحب کی صحت بھی اب ٹھیک نہیں رہتی۔ نماز پڑھانا بھی ان کے لیے دشوار لگتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ اب امامت کی ذمہ داری قاری نور الحسن کو تفویض کیے دیتے ہیں۔ اور خطابت میں خود نبھاؤں گا۔''

''آپ مفتی کو سمجھائیں بھی۔ آج کل جس طرح کی باتیں ان کے بارے میں سننے کو ملتی ہیں وہ نیک لوگوں کا شیوہ نہیں۔۔ جہاں بھی بندہ بشر دیکھتے ہیں اسے پکڑ کر اپنا رشتہ کروانے کی التجائیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ کوئی تک ہے؟ ہم تو ان کو نیکوکار پرہیز گار سمجھتے تھے۔ یہ کیا نکلے؟'' رانا صلاح الدین کا غصہ کم ہونے کو نہیں آرہا تھا۔

''میں انھیں ضرور سمجھا دوں گا۔ آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔'' اسی روز مفتی صاحب سے امامت وخطابت واپس لے لی گئی مگر انھیں کوئی دکھ تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ ان کی ساری توجہ اس طرف تھی کہ کسی بھی طرح ان کے عقد نکاح کا بندوبست ہو پائے۔ ایک طرف تو وہ سنت کی تکمیل کرنا چاہتے تھے، دوسری طرف ان کے اندر فطری جنسی خواہش بہت شدت سے ابھرتی تھی۔ یہ خواہش پہلے بھی ان کے اندر سر اٹھاتی رہتی تھی مگر وہ اس کو نفس کشی کے ہتھیار سے کچل ڈالتے تھے۔ لیکن اب معاملہ دوسرا تھا۔ ان کو اپنی راتیں محرومی سے بھری دکھائی دیتیں۔ خالی پہلوان کو نیند نہ کرنے دیتا تھا۔ آدھی آدھی رات کو وہ اٹھ کے نلکے کے نیچے جا بیٹھتے اور کئی گھنٹے بیٹھے نہاتے رہتے۔

اچانک ایک دن زیب النسا کی موت ہوگئی۔ صحت مند، تندرست، گھومتے پھرتے اچانک گری اور رخصت ہوگئی۔ مفتی صاحب جو والد اور والدہ کے انتقال پر بھی رونے سے پرہیز کرتے رہے تھے، وہ تڑپ تڑپ کر روئے۔ کوئی انھیں حالِ دل سننے والا ہمراز نہ ملا تھا جس کے ساتھ وہ اپنا غم بانٹ سکتے۔ زیب النسا کی موت کے بعد وہ اس صدمے سے بیمار پڑ گئے۔ بیماری سے اٹھے تو بالکل کمزور اور نقاہت سے بھرا جسم لے کر اٹھے۔ خود کلامی کا وصف ان میں پیدا ہوگیا تھا۔ لائبریری ہو، مسجد یا اقامت گاہ، وہ بیٹھے خود سے باتیں کرتے رہتے۔ ایک دو اسباق ہی پڑھا پاتے اور پھر بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے، یا لائبریری میں پڑی چٹائی کے تنکے نکال کر ان سے سامنے ٹیبل پر خیالی انداز میں لکھتے رہتے۔ اگر ان دو کاموں سے فرصت ہوتی تو بیٹھے کتابوں، الماریوں سے مخاطب ہوکر ان کو نصیحتیں کرتے رہتے۔ مفتی صاحب کی تقدس بھری قدر آور شخصیت نے لوگوں کے دلوں میں بونے کا روپ دھار لیا تھا۔ ان کی ذات ٹھٹھے مذاق اڑانے کے کام آنے لگی۔

مولانا روح الامین اب ان سے تنگ آچکا تھا مگر وہ انھیں ادارے سے نکال باہر کرنے کا راستہ نہ پاتا تھا۔ زیب النسا کے جانے کے بعد اب مفتی صاحب کے کھانے میں بھی فرق آگیا۔ پہلے جو وقت مقررہ پر کھانا پہنچتا تھا اب مدرسے کا کوئی طالب مدرسے میں پکنے والا کھانا پہنچا کے جاتا۔ کبھی دیر کبھی سویر۔ مفتی صاحب کو اب اشتہا بھی باقی نہ رہی تھی۔ کبھی کھاتے، کبھی یونہی رکھا ہوا کھانا صبح کو طالب سمیٹ کر لے جاتا۔ کھانے میں بے اعتدالی نے جسم کو نقاہت سے جکڑ لیا۔ مفتی صاحب دنوں میں بوڑھے ہونے لگے۔ اعضا نے جواب دینا شروع کر دیا۔ مگر مفتی صاحب کی شادی کی خواہش اب بھی برقرار تھی، بلکہ جوان ہوتی جا رہی تھی۔ جب بھی لڑکے بالے ان کے ساتھ بیٹھ کر تفریحاً ان کے سامنے کسی کی شادی یا کسی رشتے کا تذکرہ چھیڑتے، مفتی یا صاحب کی آنکھیں دمکنے لگتیں اور بیٹھے ہشاش بشاش ہوجاتے۔

زیب النسا کے جانے کے چھٹے ماہ جب مفتی صاحب کا جسم فکروں اور صدموں سے بوسیدہ ہوچکا تھا، تب وقت ظہر وضو کرنے کے لیے جاتے ہوئے لڑکھڑا کر وضو خانے کے فرش پر گر پڑے۔

اِدھر اُدھر سے بھاگتے طلبا نے جب تک انھیں سنبھالا، وہ بیہوش ہو چکے تھے۔ اس بار بیماری کی شدت بلا کی تھی۔ ہفتہ دس دن کے بعد بھی مفتی صاحب کا سنبھلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ مولانا روح الامین نے مفتی صاحب کے گاؤں ان کے چھوٹے بھائی کو پیغام بھیجا۔ سکیلدھو جو گاؤں میں ہی رہتا اور زمینداری کرتا تھا، جب پہنچا تو مفتی صاحب کو کمزوری اور ضعف کے عالم میں بے سروسامانی کے ساتھ کمرے میں چٹائی پر پڑے دیکھ کر سکیلدھو کے آنسو ٹپک کر اس کی بڑی بڑی مونچھوں پر آرکے۔ اس نے کسی سے بات کیے بغیر مفتی صاحب کو اٹھوایا اور گھر لے کر چلا گیا۔

دو ماہ کے مسلسل علاج معالجے کے بعد مفتی عبدالجبار اس قابل ہوئے کہ خود اٹھ بیٹھ سکیں اور چل سکیں۔ ان دو ماہ میں سکیلدھو دن رات مفتی صاحب کی خدمت میں مشغول رہا۔ اس کی بیوی بچوں نے بھی مفتی صاحب کی بہت خدمت کی۔ انہی دنوں میں جب مفتی صاحب نیم بیہوشی میں ہذیان بولتے رہے تو سکیلدھو ان کی زبانی شادی کی تیاریوں اور زیب النسا کا ذکر سنتا رہا۔ جس دن مفتی صاحب کی تندرستی کا یقین ہوا، سکیلدھو مفتی صاحب کے سامنے آبیٹھا۔

''بھائی صاحب، مولا کا شکر ہے اب آپ ٹھیک ہیں۔ یہ میں آپ کی زبان سے زیب النسا اور شادی کے قصے سنتا رہا۔ یہ کون ہے اور شادی کی کیا بات ہے؟''

مفتی صاحب کو پہلی بار کوئی دکھ درد سننے والا ملا تھا، انھوں نے اپنی سارے دکھ تکلیفیں دل سے نکال کر سکیلدھو کی جھولی میں رکھ دیں۔ مفتی صاحب کی محرومیوں نے سکیلدھو کے دل پر بھاری سل دھر دی۔ اندرونی کیفیت بیابانی سے بھر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے مفتی تپتے صحرا میں پیاس سے نڈھال بے دم ہونے والا ہو۔ سکیلدھو بول پڑا، ''بھائی صاحب، یہ گھر یہ زمینیں، ان میں آپ کا برابر کا حصہ ہے۔ آپ کے لیے ہزاروں رشتے۔ آپ یہیں رہیں اور میں آپ کی شادی کرواؤں گا۔''

سکیلدھو کی پرعزم آنکھیں دیکھ اور صادق لہجہ سن کر مفتی صاحب کی دل میں امید کی کونپل اگ آئی۔ سکیلدھو جی جان سے اپنے بھائی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں جت گیا۔ گاؤں، رشتے دار، آسے پاسے، ہر طرف اس نے کوششیں کرلیں مگر کوئی امید آسرا نہ ملا۔ مفتی صاحب اپنے فرقے کی

وجہ سے عزیز واقارب کے لیے غیر بن چکے تھے۔ ہر دروازے، ہر چوکھٹ سے سکیلد ھو کو مایوسی ملی۔ لوگ کہتے، ''سکیلد ھو، تو تو ہمارا اپنا ہے۔ مگر مفتی جبار ہم میں سے نہیں رہا۔ تو اگر اپنے لیے کہے تو ہم حاضر ہیں، مگر مفتی جبار کو رشتہ دے کر ہم مولا کے سامنے کیا منھ لے کر جائیں گے؟'' سکیلد ھو اس بات پر چپ سادھ لیتا۔ جواب دیتا تو کیا دیتا؟ وہ خود بھائی کی محبت میں مولا کے سامنے اپنے آپ کو شرمندہ پاتا تھا۔ جب سب دروازے بند پائے تو سکیلد ھو مفتی سجاد حسین کے آگے آ حاضر ہوا۔

''بھائی جی، میں نے ہر شاخ، ہر درخت میں رسی ٹانگنے کی کوشش کی مگر لوگ ماننے سے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں، مفتی ہم میں سے نہیں ہے۔ ہر ایک طرف سے امید کا دامن کھو کر میں تمھارے سامنے ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ لوگوں کا مذہب اپنا ہے۔ تمھارا مذہب اپنا ہے۔ مگر میرا کچھ اور ہی ہے۔ میری چھوٹی بیٹی سکینہ، جس کو بالغ ہوئے دو تین سال ہو گئے ہیں، وہ کسی کی منگ بھی نہیں ہے۔ اس سے تم شادی کر لو۔ گھر کی بات گھر تک رہے گی، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

سکیلد ھو کے الفاظ مفتی کے کانوں سے جسم میں داخل ہوئے اور انھوں نے اس کی رگوں اور شریانوں کو پھاڑ ڈالا۔ مفتی کو یوں لگا جیسے اس کا دماغ ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے ذروں میں تقسیم ہو کر اس کے روئیں روئیں سے بہہ نکلا ہو۔ مفتی صاحب نے جنون کے عالم میں اپنا لوتھڑا بنا جسم اٹھایا اور سکیلد ھو کو سجدے کرنے شروع کر دیے۔ چار سجدوں کے بعد اس کے حلق سے بے اختیار زمین لرزا دینے والی چیخ نکلی۔ آواز فضا کو دہلاتی اوپر اٹھی تو گھر کے چوبارے پر بیٹھے کبوتروں میں سے دو کبوتر قلابازیاں کھاتے زمین پر آ گرے اور ٹھنڈے ہو گئے۔ مفتی نے ٹوپی اتار کر کچی مٹی کے فرش پر پھینکی، اپنی ابھری ہوئی نسوں والے لرزتے ہاتھوں سے گریبان کو پکڑ کر دو حصوں میں چیر دیا اور بھاگتا ہوا ڈیوڑھی میں سے گزر کر گم ہو گیا۔

❋❋

اس وقت تو یوں لگتا ہے

سندھ پر گرمی آریائی جنگجوؤں کی طرح حملہ آور ہو چکی تھی۔ میں دوپہر کے کھانے اور قیلولے کا وقفہ لینے اپنے کوارٹر میں آیا تھا مگر گرمی کی شدت مجھے تھر کا تپتا ریگستان محسوس کروا رہی تھی۔ چھت میں لگا پنکھا بھی عیالدار ہاری کی مانند آگ اگلے جا رہا تھا۔ سکون کا ایک پل حرام تھا۔ کوارٹر کا دروازہ کھٹکنے سے ناقابل قبول ماحول کی یکسانیت میں ارتعاش آیا۔ دروازے پر ڈسپنسر رشید تھا۔ وہ ایک مریض کی طبیعت نہ سنبھلنے پر مجھے لینے آیا تھا۔ میرے لیے بھی تنور نما کمرے سے نکلنے کا سبب ہوا۔ میں شکر بجالاتا دیہی صحت مرکز کی عمارت کی طرف چلنے لگا جو اطراف سے درختوں میں گھری ہوئی، اس جہنم زدہ گرمی میں ایک قابل برداشت جگہ تھی۔ بیس پچیس سال پہلے بنی عمارت کی مشرقی جانب اونچی چھت والا بڑا ہال تھا جس کی کھڑکیاں شمالاً جنوباً تھیں۔ ہال میں دو بیڈ اور لکڑی کی چند بنچیں رکھی تھیں۔ عموماً مریضوں کو اسی ہال میں جانچا جاتا تھا۔ اسی ہال کے پہلو میں ایک کمرہ تھا جس کے اندر رکھی زنگ آلود الماری اپنا رنگ بدلنا جا رہی رکھے ہوئے تھی۔ الماری میں ادویات اور انجکشن رکھے تھے۔ مدقوق چہرے کا مالک ڈسپنسر رشید الماری اور کمرے کا نگران تھا۔ ہسپتال آنے والی مریضائیں پردے کے پیش نظر بڑے ہال کے بجائے اس کمرے میں بٹھائی اور دیکھی جاتی تھیں۔ اس کمرے کے ساتھ نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا جس میں بحیثیت ڈاکٹر میری ٹیبل کرسی موجود تھی۔ ڈاکٹر پر یاد آیا، میں اپنے ڈاکٹر بننے کی داستان بھی آپ کو سنا ہی دوں۔ ہم ل شہر کے رہائشی تھے۔ جب والد صاحب وہاں جا کر آباد ہوئے، تب شہر کی زیادہ تر آبادی رئیس کینال کے اس پار تھی۔ رائس کینال انگریزوں کے دور میں چاول کاشت کرنے والے علاقوں کے لیے بطورِ خاص بنایا گیا اور نام بھی رائس کینال رکھا گیا مگر مرور زمانہ کے ساتھ اس کا نام ''رائس کینال'' سے زبان حال مطابق ''رئیس کنال'' ہو گیا۔ ہماری کٹیا گھاڑ واہ اور رئیس کنال کے سنگم پر تھی۔ اس جگہ

آبادی نہ ہونے کے برابر اور کھیت کھلیانوں میں شام کے وقت ویرانی رہتی تھی۔ والد صاحب دریاے سندھ کے پار سے یہاں آ بسے تھے۔ ل نہر آ کر انھوں نے مچھلی مارکیٹ میں مزدوری شروع کی۔ پھر سبزی کا ریڑھا لگانے کا کام کرنے لگے۔ ماں سندھی ٹوپیاں بناتی جو میں اور وہ ایک ہندو دکاندار کو بیچ آتے۔ ہندو حساب کتاب میں بہت صاف اور سیدھا تھا۔ دوسرے دکانداروں کے طرح اس نے کبھی ہمارا حق مارنے کی کوشش نہیں کی۔ چھوٹی بہن ذرا بڑی ہوئی تو ماں نے اسے بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ کچھ عرصے بعد میرے سمجھدار ہونے پر والد صاحب جان پہچان والے سے آدھیارے پر بھینس لے آئے۔ جیسے رواج ہے، بھینس کو چارا کھلانا ہماری ذمے داری اور بھینس مالک کی۔ باقی بھینس کے پیدا ہونے والے بچے میں دونوں حصہ دار۔ اس کے علاوہ بھینس سے حاصل ہونے والا دودھ ہماری ملکیت۔ دودھ کچھ بیچتے اور کچھ رات کو روٹی کے ساتھ کھا لیتے۔ مجھے اب بھی وہ احساس یاد ہے جب شام کے وقت ہاتھ میں لاٹھی پکڑے بھینس چرانے اور اسے گھاڑ واہ میں نہلانے کے لیے نکلتا، مجھے اپنا آپ اہم لگتا۔ بھینس سنبھالتے دو تین ماہ ہوے تھے، بھینس کو ملاپ کی خواہش ہوئی۔ اس نے ڈکرانا شروع کر دیا۔ ماں نے مجھے والد کو بلانے بھیجا۔ اگر بھینس کو فوراً سانڈ کے پاس نہ لے جایا گیا تو اس کا خیال بدل جائے گا۔ پھر اکیس دنوں تک وہ لگ نہیں کروا پائے گی۔ والد صاحب مجھے ریڑھے پر چھوڑ کر گئے۔ بھینس کو عبدالغفور لاشاری کے سانڈ سے لگ کروا آئے۔ میرا بھی بڑا دل تھا کہ اس منظر کو دیکھوں مگر ریڑھا کون سنبھالتا۔ خیر، بھینس کو حمل کیا ٹھیرا، ہمارے گھر ایک امید نے جنم لیا۔ اماں مجھے اور میری بہن کو اپنے پاس بٹھا لیتیں، دعا مانگنے کا کہتیں۔ "دل سے دعا مانگو، رب بھینس کو بچھیا دے۔ وہ چھوٹے بچوں کی دعا بہت قبول کرتا ہے۔" ہم آنکھیں بند کر کے دعا مانگتے۔ خدا کو بھی یہی کرنا پسند آیا۔ بھینس کی بچھیا پیدا ہوئی۔ شاید وہ پہلا دن تھا جب میں نے اماں ابا کو خوش پایا، ورنہ عید کے دن بھی ابا عید نماز سے آنے کے بعد ہمیشہ کی طرح مایوس دکھتے۔ ماں کا حال بھی ان سے مختلف نہ ہوتا۔ نہ کوئی آتا نہ ہم جاتے، بس دونوں بہن بھائی آپس میں کھیلتے شام کر دیتے۔ بچھیا پیدا ہونے کے بعد بھینس کو دو ڈھائی دن جو دودھ اترا وہ بہت گاڑھا تھا۔ اماں نے اس دودھ میں شکر ملا کر خوب کاڑھا۔ وہ برتن میں ٹکیا کی طرح جم گیا۔ دن بھر ہم اس کی ٹکیاں چھری سے کاٹ کاٹ کر کھاتے رہتے۔ جب میں انٹر تک پہنچا تب دو اپنی بھینسیں ہو چکی تھیں اور گھاڑ واہ کے کنارے سرکاری زمین پر ہمارا جو چھپرا تھا وہ

کچی اینٹوں سے بنے ایک کمرے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں کی جگہ ہم نے رلیاں ٹانگی ہوئی تھیں۔ چار دیواری کی جگہ سرکنڈوں کی باڑ تھی جس کو ہر سال میں اور والد صاحب جھاڑیوں کی کانٹوں بھری شاخیں لا کر، اس کا گھٹ جانے والا قد برابر کر دیتے۔ اگرچہ اماں ابا کی محنتوں سے ہماری ظاہری حالت میں تو قدرے بدلاؤ آیا مگر پھر بھی میری ذہنی کیفیت پہلے کی جیسی تھی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس جکڑے رکھتا تھا۔ میں کسی سے دوستی یا قریب جانے سے گریزاں رہا کرتا۔ کئی ایک لڑکوں کی دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے باوجود پڑھائی کو برقعے کی طرح استعمال کر کے اس کی آڑ میں الگ تھلگ رہتا۔ پڑھائی میری واحد دلچسپی ہونے کے وجہ سے انٹر میں اچھے نمبر ملے اور میڈیکل کالج میں میرا داخلہ بآسانی ہو گیا اور میں ڈاکٹر بننے ج شہر میڈیکل کالج چلا گیا۔ میں حسب عادت دیگر سرگرمیوں سے دور لائبریری اور ہاسٹل میں پڑھائی کرتا رہتا۔ کورس کے بڑھتے دنوں کے ساتھ ابا کی ضعیفی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کا درخت کے تنے سا سیدھا کھڑا جسم جھکنے لگا تھا مگر ضروریات نے انھیں سائے بنائے رکھنے پر مجبور کیا ہوا تھا۔ وہی گھسی پٹی بات کہنا پڑتی ہے کہ مشکل وقت کا اچھا پہلو یہ ہے کہ وہ بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری مشکلات کا خاتمہ مجھے نوکری مل جانے سے ہوا۔ پھر ہمارا اچھا وقت شروع ہوا۔ لیکن یہ اچھا وقت میرا اور میری بہن کا تھا۔ اماں اور ابا نے جن نامہربان ساعتوں کے درمیان زندگی کاٹی تھی اس نے انھیں خوشیوں کا رس کشید کرنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ان کے محسوسات خوشی اور غم میں امتیاز کرنا چھوڑ چکے تھے۔ اس عرصے میں میرا ذہن ابا اماں کی غمزدہ شکلوں، ان کے پوشیدہ ماضی، اور اپنے دکھ تکلیف کا عادی ہو چکا تھا۔ ابا یا اماں ہمیں کبھی اپنے آبائی علاقے کے بارے کچھ خبر نہ دیتے تھے۔ میری پہلی پوسٹنگ ش شہر میں ہوئی۔ ہم لوگ گھاڑ واہ کے کنارے سے اٹھے اور ہاسپٹل کے احاطے میں بنے سرکاری گھر میں منتقل ہو گئے۔ کوئی تین ایک سال بعد ہم اچھی زندگی میں تھے۔ بہن کی شادی ہو چکی تھی اور میرے لیے رشتہ دیکھا جا رہا تھا۔ اُن دنوں ابا کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ وہ بیٹھتے یا لیٹتے تو اٹھ نہ پاتے۔ اور اگر اٹھتے تو بے چینی کی کیفیت میں اِدھر سے اُدھر چلتے رہتے۔ کسی جگہ ٹک نہ پاتے۔ کچھ دیر کمرے میں بیٹھتے تو پریشان ہو کر صحن میں آ بیٹھتے، پھر گھر سے باہر ہسپتال کے سامنے موجود درختوں کے نیچے جا بیٹھتے، تھوڑی دیر کے بعد پھر گھر آ جاتے۔ مجھے ڈاکٹر ہونے کے باوجود سمجھ نہ آتی تھی۔ تمام ٹیسٹ کلیئر تھے، ان کی حالت سدھر نہیں پا رہی تھی۔ وزن روز بروز کم ہوتا جا رہا

تھا۔ رات کو سوتے اچانک چیخ کر اٹھ بیٹھتے۔ میں دوڑ کر انھیں سنبھالنے لگتا مگر وہ پکڑ میں نہ آتے۔ جنوری کے ایک سرد دن کی بات ہے، ابا شام کو اٹھے، نہائے دھوئے، رات کا کھانا کھایا اور سونے چلے گئے اور پھر نہیں اٹھے۔ اندازہ یہ تھا کہ کچھ کھایا ہے مگر اماں نے پوسٹ مارٹم کرنے نہیں دیا۔ ابا گئے تو ایسے ہی نہیں گئے۔ ادھ مری اماں کو اور مار گئے۔ رہی میری بات، میں جیسے خلا میں معلق ہو گیا۔ ہر طرف خالی پن تھا اور اماں ابا کے پوشیدہ ماضی کے بارے میں اٹھتے اضطرابوں نے بے چینی اور اذیت کا کسا ہوا پھندا میرے گلے میں ڈال دیا۔ اس سے نجات کے لیے میرے پاس اماں ہی ذریعہ تھیں۔ میں نے کئی بار ان سے سوالات کے جواب جاننا چاہے مگر جواب میں اماں کے پاس صرف آنسو ہی ملتے۔ آہستہ آہستہ اس ابا والی بے چینی کے ساتھ میں نے گزارنے کی عادت ڈال لی۔

اب میں واپس لُو لگ جانے والی مریض کی طرف آتا ہوں۔ میری کہانی کے اختتام اور لُو لگ جانے والے مریض کی کہانی کے درمیان آپ عرصہ چھ سال جوڑ لیں۔ اماں رخصت ہو چلی تھیں۔ میں ابھی تک غیر شادی شدہ تھا اور ایک دیہی صحت مرکز میں اپنے فرائض نبھا رہا تھا۔ ش شہر میں عرصہ پانچ سال بعد میرا تبادلہ ہونے لگا اور مجھے اس کے لیے تین اضلاع کا آپشن دیا گیا اور میں نے ن ضلع کی اس تحصیل کا انتخاب کیا۔ میں ہال میں داخل ہوا۔ کھڑکیاں تیز گرمی کی وجہ سے بند تھیں اور اندر نیم روشنی کا ماحول تھا۔ ہال کے اندر پڑے سبز ریگزین کے بیڈ پر ایک بوڑھا مریض پڑا ہوا تھا۔ بیڈ کے ادھڑے کناروں سے پیلا گدا جھانک رہا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب، یہ روڈ پر چلتے چلتے گر پڑا۔ نانا فتو اسے ہسپتال میں چھوڑ گیا ہے۔“ رشید بولنے لگا تھا۔ نانا فتو ہوٹل والے کا نام تھا۔ چائے کا یہ ہوٹل ہسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی تھا۔

”اچھا“ میں نے مریض کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

”صاحب، اس پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے۔“

”ڈی ہائیڈریشن لگتی ہے، گلوکوز کی ڈرپ لگا دو۔“ جسم پانی کی کمی کے باعث گرمی سہار نہ سکا تھا اور اندرونی ٹمپریچر کی وجہ سے مریض نیم بیہوشی میں تھا۔ ڈرپ لگ جانے کے بعد میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ پچپن ساٹھ سالہ، سانولی رنگت، دراز قد اور ضعیف جسم میں تھا۔ گھنی مونچھوں کے ساتھ بالکل ہلکی سی ڈاڑھی اس کے رخساروں پر اوپر تک چڑھی ہوئی تھی۔ معمولی سوتی کپڑے کا پیراہن

اور لال رنگ کا انگر کھا باندھا ہوا تھا جو پنکھے کی ہوا سے اس کے داہنے گھٹنے سے ہٹ گیا تھا۔ اس کی لانبی سانولی ٹانگ ران تک ظاہر ہو رہی تھی۔ دانتوں سے محرومی پانے کا سفر کرتا ہوا منھ کسی ڈراؤنے غار کی طرح کھلا تھا۔ کچھ دیر ڈرپ چلی۔ مجھے اطمینان ہوا اور میں رشید کو خیال کرنے کی ہدایت کر کے اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ شام کو رشید سے اس کا احوال پوچھا۔

''صاحب، وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اپنے نانا فتو کا واقف تھا۔ اس نے تانگا کروا کر اسے گاؤں بھیج دیا۔''

اکتوبر کی آخری دنوں کی بات ہے۔ سردی کی اولین لہریں پہنچنا شروع ہوئی تھیں۔ فضا میں خنکی کا عنصر دلپذیر تھا۔ صبح گیارہ بجے کے قریب جب میں ہسپتال کی عمارت کی سامنے درختوں کے نیچے کرسی ڈالے مریضوں سے فارغ حالت میں بیٹھا تھا، ہسپتال کے بیرونی احاطے کے کھلے گیٹ سے گدھا گاڑی داخل ہوئی۔ گاڑی میں رلی کے اوپر کوئی شخص پڑا ہوا تھا اور گدھے کی لگام کھینچتے ہوئے شخص کے علاوہ نانا فتو اور دوسرا شخص اس جسم کو اٹھا کر اندر ہال میں رکھنے لگے۔ میں نے چیک کیا تو مضروب شخص کی خراب حالت کے باوجود کوئی سیریس مسئلہ نہ تھا۔ گرد سے لتھڑے خون آلود لباس میں ملبوس شخص کے سر میں زخم تھا۔ جسم پر بھی لاٹھیوں کے ابھرے نشان موجود تھے۔ سر کے زخم میں ٹانکے لگانے اور جسم کے زخموں کو صاف کر کے ٹنکچر لگانے تک میں جان چکا تھا کہ یہ وہی پچپن ساٹھ سالہ سانولا شخص تھا جو کچھ ماہ پہلے ڈی ہائیڈریشن سے بے ہوش حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔

''نانا، خیر تو ہے۔ کیسے ہوا یہ سب؟'' میں نانا فتو سے پوچھنے لگا۔

''صاحب، وہ گاؤں میں جھگڑا و گڑا ہوا تو اس میں چوٹیں لگ گئیں خدا بخش کو۔''

''پھر پولیس کو اطلاع کریں؟''

''نہیں صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسی باتیں روز ہوتی رہتی ہیں گاؤں واؤں میں'' نانا فتو زور دے کر بولا۔

''نانا، یہ تمھارا رشتے دار ہے؟''

''نہیں صاحب۔ یہ گوٹھ مراد خان سہتو کا ہے۔ اپنے گاؤں میں بسکٹ مسکٹ، کیک پاپے بیچتا ہے۔ شہر آتا ہے تو میری ہوٹل پر چائے وغیرہ کے لیے بیٹھتا ہے۔ تو اپنا ہی ہے، واقف ہے۔'' کچھ ہی

دیر میں مضروب شخص کراہتا ہوا اٹھنے لگا۔ نانا فتو نے اسے سہارا دے کر بیٹھنے میں مدد دی۔

''یار پھتاح (فتاح)، حرامیوں نے بہت مارا ہے۔ کوئی لحاظ نہیں،'' زخمی شخص اپنے زخموں کو ٹٹولتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔ کچھ نہیں ہوا۔ ململ پٹی ہو گئی ہے۔ سب خیر ہے۔''

''یار خیر کہاں؟ میری عمر ہے مار کھانے کی؟ بڑی عمر والوں کا لحاظ، کوئی خیال ہوتا ہے۔ وڈیرا سومار تو حرامی ہے، اس کے بیٹے بھتیجے اس سے بھی بڑے کمینے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات ہے تو پولیس کے پاس رپورٹ کروا دیں،'' میں نے ایک قدم زخمی شخص کی طرف بڑھا کر کہا۔ زخمی شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس کو ایک جھٹکا لگا۔ مجھے اس کے تاثرات میں خوفزدگی ظاہر ہوتی نظر آئی۔

''نہیں صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ خود رئیس کے باغ کے لیموں چوری کر کے بیچتا ہے اس لیے اسے مار پڑتی ہے،'' نانا فتو بول پڑا۔ "اور بھلا ہم پولیس کے پاس جائیں گے تو وہ رئیس سومار خان کے خلاف ہماری سن لے گی کیا؟'' نانا فتو بات کرتا جا رہا تھا، اتنے میں زخمی شخص بیڈ سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ اٹھتے اٹھتے خود کو سنبھال نہ پایا اور فرش پر گر گیا۔ میں، رشید ڈسپنسر اور نانا فتو اس کی طرف لپکے۔

''ارے خدو، یہ کیا کر رہا ہے؟ مرنے کا ارادہ ہے کیا؟ چپ کر کے بیڈ پر لیٹ جا۔''

''نہ پھتاح خان نہ۔ مجھے ڈر آ رہا ہے۔''

''شاید دماغ والی چوٹ کا اثر ہے۔ میں اسے آرام کی انجکشن دیتا ہوں۔'' میں یہ کہتے ہوئے انجکشن تیار کرنے لگا۔

''اڑے کھدو، پاگل نہ بن۔ ابھی تیرا علاج ہوگا۔ چل لیٹ جا!'' نانا فتو کا جملہ سن کر زخمی شخص بیڈ پر لیٹ گیا مگر اس کی خوف سے بھری نگاہیں مجھ پر ٹکی رہیں۔ میں انجکشن کے بعد اس کو آرام آنے تک وہیں رکا رہا اور پھر رشید کو اسے ایک دن ہسپتال میں رکھنے کی ہدایت دے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ شام کو چیک کرنے گیا تو خدا بخش بہتر حالت میں نظر آیا۔

''آپ بہتر ہیں مگر آج کی رات یہیں رہیں۔ کل صبح آپ جا سکتے ہیں۔''

''ڈاکڈر (ڈاکٹر)، مجھے چھوڑو۔ میں پھتاح کی ہوٹل میں سوؤں گا۔ یہاں ہسپتال میں مجھے ڈر آتا ہے،'' خدا بخش دونوں ہاتھ جوڑ کر منت بھرے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے بابا۔ ہوٹل ساتھ ہی ہے۔ اگر کچھ تکلیف ہو تو مجھے یا رشید کو اٹھا دینا۔''

رشید خدا بخش کو نانا فتو کے پاس چھوڑ آیا۔ آتی سردیاں دھان کی فصل کی طرح جلد اپنا قد بڑھا رہی تھیں۔ سورج روپ بدل کر مہربان دوست بن گیا تھا۔ اس کی کرنوں میں بیٹھنے سے خمار کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ ہال اور کمرے کے بجائے مریض اب باہر دھوپ میں دیکھے جا رہے تھے۔ کچھ عرصے سے میں نے نوٹ کرنا شروع کیا تھا کہ کبھی کبھار ہسپتال کے گیٹ یا بیرونی احاطے کی کمر سے ذرا اوپر دیوار کے پار خدا بخش کھڑا ہوا تکتا نظر آتا۔ میری نگاہ پڑتی تو گڑبڑا کر چھپ جاتا۔ دسمبر کا آغاز شمال سے آنے والی سرد ہواؤں نے بڑے طمطراق سے کیا۔ ہر طرف ان کے قہر کی سلطنت قائم تھی۔ درختوں نے بھی ان کے جبر کے آگے مجبور ہو کر اپنے پتے جھاڑ کر سائیں مست علی شاہ کی طرح خود کو ننگا کر لیا تھا۔ ایک شام، جس میں گونگی بارش کی بوندیں بے آواز گری جا رہی تھیں اور کالے بادلوں نے اپنا سیاہ پھن لہرا کر آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا، میں کڑکتی سردی سے دو لحاف اوڑھے جلتے بلب کی روشنی میں امر جلیل کی کہانیوں کی کتاب (جڈھن مان نہ ھوندس) جب میں نہ رہوں گا پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں کنڈی بجنے کی آواز آئی۔ بلا تعطل اور مسلسل۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک۔ میں چھتری اٹھا کر کمرے سے صحن میں آیا۔ فرش میں لگی چوکور سرخ اینٹیں پانی کی پتلی چادر کے باوجود عریاں ہو رہی تھیں۔ سندھ کی گرد آلود فضا سے برس کر، اینٹوں پر جمع ہونے والی مٹی کا آخری ذرہ بھی پانی نے رہنے نہ دیا تھا۔ میں نے دروازہ کیا کھولا، ایک انسانی وجود مٹی کے ڈھیر کی طرح میرے پاؤں میں گر گیا۔ نیم تاریک ماحول میں مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا کہ دو بازوؤں سے میری ٹانگوں میں حلقہ بنایا گیا اور بین کی آواز ابھری۔ دل کو لرزا دینے والی۔ ایک ایسی آواز جو تکلیف اور درد کے اظہار کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔ میں اٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ بازو پاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ میں مشکلوں سے سنبھالتا اسے اندر کمرے میں لایا اور کرسی پر بٹھانے میں کامیاب ہوا۔ میں نے روشنی میں اسے دیکھا اور دیر میں اسے پہچانا۔ یہ خدا بخش تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں غائب اور چہرے کے بعض حصے سیاہی سے رنگے تھے۔ اس کا بین جاری تھا، گو میرے بولنے پچکارنے سے کمی آئی تھی۔

"بابا خدا بخش، کیا ہوا ہے؟ پھر وڈیرے سومار کے چیلوں نے مارا ہے؟ اور تمھاری مونچھیں؟ یہ کیا ہوا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب، مار کھانے سے خدا بخش روتا وو تا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب، آج دوسری بات ہے۔" رونے میں وقفہ کرتے خدا بخش نے جملہ پورا کیا اور پھر بین کرنے لگا۔

"اللہ سائیں، او میرے اللہ سائیں۔ میں کیا کروں؟ ڈاکٹر صاحب، مجھے معاف کر دو۔" وہ کرسی سے اٹھ کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ "ڈاکٹر، میں کمینہ ہوں۔ مجھ میں غیرت نہیں۔ یہ لو۔" میرے پاؤں سے جوتا نکال کر میرے ہاتھ میں تھمانے لگا۔ "یہ لو، میرے منھ پر مارو۔ او اللہ سائیں!" وہ پھر بین کرنے لگا۔

"بابا خدا بخش، یہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے اس کے ہاتھ سے جوتا لے کر پھینک دیا۔ "اٹھو، کرسی پر بیٹھو۔ بتاؤ، ہوا کیا ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر، نہیں۔ تم مجھے جوتے مارو۔ میں اسی لائق ہوں۔ آج وڈیرے نے میرا کالا منھ کیا ہے۔ یہ تو کوئی سزا ہی نہیں۔ اصل درد تو یہاں ہے یہاں۔" اپنے پھٹے اور گیلے گریبان سے نظر آتی پسلیوں پر سیدھے ہاتھ سے مکے مارتا ہوا کہنے لگا۔

"بابا، تم اٹھ کر کرسی پر بیٹھو۔ مجھے بتاؤ، بات ہے کیا؟"

"ڈاکٹر، تمھیں میرا پتا چلے گا، تم میرے منھ پر تھوکو گے۔ میں نے کام ہی ایسا کیا ہے۔ پر ڈاکٹر صاحب، میں بڑا ڈرپوک ہوں، اس لیے خطا ہو گئی، بابا۔ بہت بڑی۔ وڈیرا کیا میرا منھ کالا کرے گا، میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنا منھ کالا کر چکا ہوں۔" وہ کمرے کے فرش پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے منھ پر مٹی ملنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو خدا بخش! اٹھو، کرسی پر بیٹھو۔" میں نے خدا بخش کے جسم کو اٹھا کر زبردستی کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر، میں بتاؤں گا، پھر جو تم کرسی پر بٹھا رہے ہو، مجھ پر تھوکو گے۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتا جا رہا تھا۔

"پہلے تم اپنا ہاتھ منھ گرم پانی سے دھوؤ، پھر مجھے اپنی بات بتاؤ۔"

''نہیں، میں اسی طرح بتاؤں گا۔ اور ابھی بتاؤں گا۔'' وہ پھٹے ہوئے گیلے کپڑوں کے ساتھ کالک ملامٹی آلودہ چہرہ لیے کرسی سے نیچے بیٹھ گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، سناؤ۔''

''ڈاکڈر، تم علی حسن سہتو کے بیٹے ہو ناں؟''

''ہاں!'' حیرت زدہ حالت میں میری زبان سے بے اختیار جواب نکلا۔

''میں اسی دن پہچان گیا تھا۔ تم صفا اپنے باپ جیسے ہو۔ تمھارا نام اُلھندو بھی میں نے ہی رکھا تھا۔''

''اچھا!'' میری حیرت کم نہ ہوئی۔

''ڈاکڈر، تمھارے باپ سے میری سگی یاری تھی سگی۔ پھر میں ہی کمینہ نکلا۔ مگر میں کیا کرتا؟ میں ڈر گیا تھا ڈاکڈر صاحب۔''

''تم میرے والد کو کیسے جانتے ہو؟''

''علی حسن کو خدا بخش نہ پہچانے تو اور کون پہچانے؟ وہ میرا یار تھا، ڈاکڈر۔ سارے دکھ سکھ کٹھے کاٹے۔ پھر وڈیرے سومار حرامی نے حرامپائی کی۔ پر ڈاکڈر، اصل بے غیرت تو میں نکلا۔ وڈیرا تو ازلی حرامی دشمن ہے۔ دوست تو میں تھا۔''

''آپ ان کے دوست تھے؟''

''دوست کہاں، میں ہی تو اس کا دشمن بنا۔ پر ڈاکڈر، پہلے میری پوری بات سننا، پھر جو جی میں آئے مجھے قبول ہے۔ خدو ویسے بھی کب کا مر گیا ہے۔ ڈاکڈر، ہم پہلے منچھر جھیل پر رہتے تھے۔ کشتیاں ہمارا گھر تھیں۔ وہیں کاروبار تھا۔ صرف ہم نہیں، ہمارے سارے رشتے دار بھی کشتیوں میں رہا کرتے۔ شادیاں، بچوں کی پیدائش، سب وہیں کشتی پر۔ پورا گاؤں تھا منچھر پر۔ رگو (صرف) ہمارا گاؤں نہیں، کئی گاؤں تھے منچھر میں۔ ہم کشتیوں سے بس فوتگی پر دفنانے کے لیے زمین پر اترتے۔ پھر اس جھیل میں زہریلا پانی آملا۔ مچھلیاں مرنے لگیں۔ بچے مرنے لگے۔ ڈاکٹروں نے ٹیسٹ ویسٹ کی، بتایا منچھر کا پانی زہریلا ہے۔ میرا باپ کشتی سے اٹھ آیا۔ رشتے داروں کے روکنے کے باوجود بھی پیٹ کے پیچھے وہ رئیس سومار خان کے باپ سہاگو خان کے مچھلی کے تالاب پر آبیٹھا۔ تالاب سے گزران

اچھا ہونے لگا۔ میں یہاں آ کر خوش تھا۔ زمین پہلی بار ملی تھی۔ یہ تو جنت تھی۔ سارا دن بھاگتا پھرتا۔ تمھارے باپ کے ساتھ بکریاں چرانے قبرستان چلا جاتا۔ ہم دوپہر کو بکریاں کسی بکروال کو دے کر گڈو بیراج نہانے چلے جاتے۔ وہاں دوسرے کنارے پر ناک کی سیدھ میں تیرنے کے مقابلے لگتے۔ میں تو میر بحروں کی اولاد تھا اور ابا کہتا تھا مچھلی اور میر بحروں کے پھیپھڑے ایک ہی مٹی سے بنے ہیں، پر سائیں، تمھارا باپ تو لوہے کا تھا صفا۔ گڈو بیراج کے کنارے شیشم کا درخت کے سامنے جا نکلنا ہوتا تھا۔ بیراج کی تیزی قصائی کی چھری کی طرح ہے آج بھی، پر تمھارا باپ آٹھ لڑکوں میں اکیلا ہوتا جو شیشم کی کالی چھاؤں میں جا نکلتا۔ ہاہ۔ بس ڈاکٹر، پھر تمھارا باپ تو تمھارے دادا کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے لگا اور میں نے رئیس سہاگو خان کی چاکری کر لی۔ مجھے مچھلی کی بو بہت بری لگتی تھی۔ وہ بو ایسی ہے کہ کھال کے اندر گھس جاتی ہے۔ نکلتی نہیں۔ اماں، ابا، دوسرے بہن بھائیوں سے مجھے وہی بو آتی۔ میں نے ابا کو مچھلی کا کام کرنے سے صاف جواب دے دیا۔ اس نے مجھے سہاگو خان کے پاس کام کے لیے چھوڑ دیا۔ رئیس سہاگو کے پاس میں صبح شام جانوروں کے لیے چارا کاٹتا اور رئیس جس وقت اوطاق میں بیٹھتا، میں اس کی ٹانگیں دابتا رہتا۔ پھر میں رئیس کے آدمیوں میں ہوتا گیا۔ ہم دو تین لوگ رات کو جا کر رئیس کی زمین کے لیے پانی چوری کرتے۔ رئیس کی زمینیں بہت تھیں، اس کے حصے کا پانی زمینوں کو بھر نہیں پاتا۔ ہم دوسرے چھوٹے موٹے زمینداروں کے حصے کا پانی توڑ کر ساتھ لاتے۔ کسی میں کیا دم کہ رئیس کے لوگوں سے ٹکر لے۔ آتے تو ہم مار مار کر ادھ موا کر دیتے۔ سال چھٹے ماہ جب نئی فصل لگانے کے لیے زمین تیار ہوتی تو رئیس کے اشارے پر ہاری ایک آدھ فٹ دوسرے کی زمین کی طرف بڑھ جاتے۔ جہاں کوئی سامنے آتا تو ہم ڈنڈے لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ میری دہشت پھیلنے لگی اور میں رئیس کے بدمعاشوں کا سردار بن گیا۔ ابا نے بڑا سمجھایا، بیٹا، ہم پانی کے لوگ ہیں، ٹھنڈے اور نرم۔ ہم کسی سے جھگڑا فساد نہیں کرتے۔ پانی والوں میں سب سانجھا ہوتا ہے۔ ان زمین والوں کی بات اور ہے۔ ان میں حد بندی ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بہت پرے ہوتے ہیں، ان کے راستوں پر نہ چلو۔ یہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے، تم تو ان کے غیر ہو۔ مگر میں نے سنا ہی نہیں۔ رئیس نے میری شادی کروا دی اپنے ہاری کے ہاں سے۔ میرا تو پھر خاندان بھی بدل گیا۔ میں رئیس کی چاکری میں لگا رہا اور تمھارے باپ نے اپنے باپ دادا کی زمین کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ وہ سبزی

کاشت کرتا تھا۔ شہر میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ۔ جب تمھارا دادا فوت ہوا تھا تب تک تمھارے باپ نے نیا گھر بنالیا تھا۔ گاؤں میں رئیس کی حویلی کے بعد یہ پہلا مکان تھا جو پکا تھا۔ یہ بات رئیس کو تیر کی طرح دل میں لگ گئی اور تمھارا باپ پہلے ہی اسے کھٹکتا تھا۔ باقی گاؤں برادری ہفتے دو ہفتے اسے سلام کرنے آتے تھے۔ تمھارا باپ عید بڑی عید کے سوا رئیس کی اوطاق کا رخ ہی نہ کرتا تھا۔ تمھارا باپ اپنی زمین میں لگا رہا۔ تمھاری پیدائش کا دوسرا سال تھا، رئیس سبھاگو کو پتا چلا بشیر پنجابی کا تین ایکڑ کا ٹکڑا علی حسن نے خرید لیا ہے۔ رئیس تو آپے سے نکل گیا۔ اس علاقے کی ریت تھی کہ جو بھی زمین فروخت ہوتی وہ رئیس ہی خریدتا تھا۔ کسی اور کو خریدنے کی اجازت نہ تھی۔ رئیس زمین کی قیمت بالکل مار کر خریدتا تھا، اس لیے بشیر پنجابی ڈاکوؤں کے ڈر سے پنجاب بھاگا تو جاتے جاتے خاموشی میں اچھی قیمت پر زمین علی حسن کو دے دی۔ رئیس نے خبر ملتے ہی مجھے، نورے اور دادن کو بلایا۔ رئیس سبھاگو خان آگ کا گولا بنا ہوا تھا۔ اس کی پگ کا مسئلہ تھا۔ آج علی حسن نے یہ کام کیا تھا تو کل کسی اور کو ہمت ہو جانی تھی۔ رئیس علی حسن کے عضو ے توڑ دینے کے سوا راضی نہ تھا۔ ہم تو لچ لفنگ تھے۔ ایک بار بولنے کی کوشش کرتے ہوئے گالیاں کھا کر منھ بند کر لیا۔ مگر علی حسن خان کی ٹانگیں توڑنے والا خیال ملاں شیرل نے رد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا، علی حسن ایک دو بندوں کو ساتھ لے کر مرے گا اور پھر اس کا خاندان بھی بڑا ہے۔ ان کو منھ دینا مشکل ہے۔ اس نے بات دوسری کی۔ رئیس کو اس کی بات دل سے لگی۔ علی حسن کو نورے کی ماں کے ساتھ کالا بنا دو۔ گواہی میری۔ نورے کو دس ہزار ملے۔ اسی رات اس نے بڑھیا کو قتل کر دیا۔ صبح علی حسن کو رئیس کی اوطاق پر باندھ دیا۔ فیصلہ شروع ہو گیا۔ فیصلہ ملاں شیرل اور پنچایت نے کرنا تھا۔ نورے نے علی حسن پر ماں کا الزام لگایا اور گواہی میں میرا نام لیا۔ میں نے قرآن اٹھا کر قسم دی۔ فیصلہ ہو گیا۔ ملاں شیرل نے علی حسن کو بخش کر کے اس کی زمین گھر نورے کے حوالے کیے اور علی حسن کا منھ کالا کر کے پورے گاؤں میں گھمانے کا فیصلہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب، میں مجبور تھا۔ ڈر گیا تھا۔ رئیس نے گواہی نہ دینے پر مجھے کالا کرنے کی دھمکی دی تھی۔ علی حسن کو کالا کر کے مارنے کا فیصلہ ہوا، پر اس کی برادری نے اس کے صاف ہونے پر قسم قرآن دیا۔ پھر مجبوراً فیصلہ بدل کر ملاں شیرل نے اسے گاؤں سے نکال دیا۔ اس کا ہاتھ بند کر دیا گیا۔ اب اس کے ساتھ کوئی برادری والا نہ بات کرے گا نہ ہی کوئی مٹ مائٹ (رشتے دار) ملنے جائے گا۔ کوئی اس کے گھر میں پاؤں نہیں رکھے گا۔ علی حسن اسی رات یہاں سے بال

بچوں کے ساتھ جانے کہاں چلا گیا۔ پھر اس کی کچھ خبر نہ ملی۔ اب تم ملے ہو۔ تمھیں دیکھتے ہی پک (یقین) ہوگئی کہ یہ ڈاکڈر علی حسن کا بیٹا ہوگا۔ صفا صاف نشانیاں ظاہر ہیں منھ سے۔ ایسا اندھا تو نہیں میں جو پہچان نہ پاؤں۔ ڈاکڈر، میں پوری عمر اپنا منھ کالا کرتا رہا۔ درد نہیں جاتا۔ تم میرے منھ پر تھوکو، میرا منھ کالا کرو، مجھے گدھے پر چڑھا کر گھماؤ یا زہر کی سوئی لگا کر مار دو۔ پر ڈاکڈر، مجھے قسم قرآن کی ہے، میں موت سے ڈر گیا تھا۔ میں صفا ڈر گیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں، موت نہیں مارتا ڈاکڈر، اس کا ڈر مار دیتا ہے۔"

میں بین کرتے خدا بخش سے اپنے پاؤں چھڑا کر صحن میں آیا۔ گلے کا پھندا سخت ہو رہا تھا۔ میں نے بند سانس باہر نکالنے کے لیے پھیپھڑے پھلا کر آسماں کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لینے کی کوشش کی۔ ہر طرف اندھیرا قائم تھا۔ کالی سیاہ رات میں ایک بھی ٹمٹماتا ستارہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

❋❋

ایک نا مختتم ٹیکا ٹیک کے آغاز کا معما

موتی نے سرخ پھولدار اور ریشمی کپڑے سے بنی، روئی سے بھری، پتلی اور چوکور گدیلی دیوار پر جھاڑ کر پہیے دار کرسی کے تختے پر پٹخی، مگر گدیلی پر پڑے میل کچیل کے کالے چکٹ، جھاڑنے سے لاپروا، کپڑے سے ناسور کی طرح چمٹے رہے۔ موتی نے آگے کھسکتے ہوئے کرسی گاڑی کو پچھلی ٹانگ سے پکڑا اور گاڑی کو دھکیل کر دو قدمچے نیچے سڑک تک پہنچانے کی کوشش کی۔ گاڑی عدم توازن کا شکار ہوتی، قدمچوں سے دھڑ دھڑاتی، سڑک پر آگے کھسکتی گئی۔ قدمچوں اور کرسی گاڑی کا درمیانی فاصلہ جانچ کر موتی نے دروازے کے بیچ لگی کنڈی کو بند کر کے تالا لگایا۔ خود کو دونوں ہاتھوں کے بل گھسیٹ کر بازو کرسی کے ہتھوں پر جمائے اور جسم کو اونچا اٹھاتے، پہیے دار کرسی پر پڑی میل کچیل کے چکٹوں والی گدیلی پر رکھ دیا۔ روز کا معمول ہونے کے باوجود اس مشقت نے موتی کو تھکا دیا۔ اب وہ وقت تھا کہ کپڑے بدلتے ہوئے بھی تھکن ہو جاتی اور نڈھال کر دیتی۔ سانس کے ٹھیر جانے کے بعد اس نے دھڑ کے نچلے حصے کو اِدھر اُدھر کر کے گدیلی کا نرم حصہ جانچا اور جسم کو آرام دہ جگہ محسوس کرنے کے بعد پہیے دار کرسی کو دھکیلنے والی چرخی کے ہینڈل کو سیدھے ہاتھ سے گھماتا، سنیما والی گلی سے چمن بزار کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی بہت سویر پن تھی۔ نیم اندھیرا۔ مگر پھر بھی جانے کیوں ملا کی آذان سے پہلے موتی کی نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ حالانکہ مسجد کی دیوار ان کے گھر کے ساتھ تھی مگر وہ دن تھے کہ موتی دیر تک پڑا اینڈتا تھا۔ اذان کی آواز تک اس کے کان میں مچھر کی طرح بھنبھنا پاتی تھی۔ اب یوں کہ آخری پہر کے آتے سحر خیز مرغے کی مانند اٹھ بیٹھ جاتا۔ چمن بزار کے قریب ہوتے سوچ آنے لگی: وہ اس سویر جائے گا کدھر؟ ہوٹل پر۔ پر چائے والے نے ہوٹل کھولا ہوگا کہ نہیں؟ ابھی تو سورج بھی خوفزدہ چوہے کی طرح دبکا پڑا ہے۔ لیکن بھلا وہ پڑے پڑے کتنی کروٹیں بدلے؟ نندو لنگڑے کے چلے جانے کے بعد اس سے اکیلے گھر بیٹھا نہ جاتا تھا۔ ہینڈل گھماتا موتی کا ہاتھ بلاارادہ آہستہ ہوتا گیا۔ گاڑی کی رفتار سست ہوتی گئی۔ گاڑی کا ایک پہیہ لہرائے جا رہا تھا۔ اسی لہرانے سے موتی کو نندو لنگڑے کی یاد آنے لگی۔ نندو لنگڑے کی دونوں ٹانگیں

کمزور تھیں۔ جیسے ان میں ہڈیاں ہی نہ ہوں۔ خالی گوشت سے بنی۔ ان لچکتی ٹانگوں کے بل چلتے نذو لنگڑے کا جسم عجیب فحش انداز میں مٹکتا تھا۔ موتی کو ایک بات یاد آ گئی۔ ایک دن موج میں موتی نے نذو لنگڑے سے پوچھ لیا تھا:

''ابے، لنگڑے یہ تو جھٹکے لے لے کر سارا دن کس کو چودتا رہتا ہے؟''

''اپنی قسمت کو، اور کس کو، بھین چود!'' نذو لنگڑے نے سانپ کی طرح بل کھا کر گالی دی تھی۔

''شکر نہیں کرتا کنجر، چود تو رہا ہے!'' جواب دیتے موتی کے حلق سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا تھا۔ تب نذو لنگڑا لچکتا اس کے منھ پر لعنت رکھنے آیا تھا اور موتی نے کرسی گاڑی بھگا کر اپنی جان بچائی تھی۔ اس یاد کے آتے ہنس پڑنے سے موتی کے کھلے منھ کے اوپری ہونٹ کے دونوں کناروں اور گالوں کے درمیان لکیر مزید گہری ہو گئی۔ نذو لنگڑے سے موتی کی لگتی بھی بڑی تھی، اور رہتے تو وہ کٹھے تھے۔ اسی ایک کمرے میں جس سے آج کل موتی اپنے نکالے جانے کی فکر میں پستا رہتا۔ اُن دنوں موتی کو یوں گھسٹ گھسٹ کر کرسی گاڑی قدمچوں سے کھسکانی نہیں پڑتی تھی۔ نذو لنگڑا گاڑی کو گھر سے سڑک، سڑک سے گھر میں رکھتا۔ موتی کو اس پر جم جانے میں مدد کرتا۔ پتا نہیں حرام زادہ بنا بتائے کہاں چلا گیا! اب موتی ڈھونڈے تو کہاں؟ چند ایک دن تو اس نے واپسی کی آس سجائے رکھی۔ جب وہ ٹوٹی تب موتی کی ہر صدا کے آخر میں ''کوئی کسی کا نہیں'' کے الفاظ کا اضافہ ہو گیا جو ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ منھ سے نکل جاتے۔

چمن بزار پہنچ کر موتی نے دکھن کا رخ کیا۔ بزار کے اوپر میلی ترپالوں اور پرانے شامیانوں کے سائبان نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ اس اندھیرپن میں ساری بزار سرنگ بنی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں جلتے زرد بلبوں کی پیلاہٹ میں پلاسٹک کی تھیلیاں اور مڑے تڑے کاغذ ہوا کے زور پر اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔ بزار پہنچ کر سڑک اوبڑ کھابڑ ہو گئی۔ دکاندار لوگ صفائی کر کے کچرا سڑک پر پھینک دیتے تھے۔ پھر اس کا کچھ حصہ جمعداروں کے جھاڑو سمیٹتے اور کچھ سڑک سے لپٹا رہ جاتا۔ وہی گند، مٹی اور پانی کا سہارا لے کر، چھوٹے موٹے انسان کی طرح اپنی جگہ بنا لیتا۔ تب جمعدار اور جھاڑو بھی اس کا بال بیکا کرنے سے قاصر ہو جاتے۔ ان اوبڑ کھابڑوں کے ساتھ گند کچرے کی ڈھیریاں بھی تھیں۔ ابھری ہوئی۔ جیسے اونٹ کے کوہان ہوتے ہیں۔ یا ان سے تھوڑا مختلف۔ ایک ڈھیر میں سے سڑتے ٹماٹروں کی بو موتی کے

نتھنوں میں گھسی۔ ہتھ گاڑی چلاتا موتی کا ہاتھ تیز ہو گیا۔ رجب قصائی کے تھڑے کے پاس خون کی بساند تھی۔ اسی جگہ آوارہ کتے مرغی کے پروں اور انتڑیوں میں تھوتھنیاں گھمار ہے تھے۔ موتی کا ہاتھ تھکنے لگا۔ اس نے تھوڑا آگے گاڑی لدھارام جنرل مرچنٹ کی دکان پر روک دی۔ پر اب لدھارام کہاں؟ اب تو یہ مجاہد جنرل اسٹور ہے۔ یہ سب یکا یک کیسے ہو گیا؟ اس خیال کے آتے موتی کی زبان پر لفظ ''یکا یک'' پھنس گیا۔ زبان تانگے میں جتے گھوڑے کی ٹاپوں کی طرح ''یکا، یک'' کو دو حصوں میں دہرانے لگی۔ یادیں، عبدالحق ساند کے گایوں کے ریوڑ کی طرح اچھلتی ناچتی، موتی کے اندر آ گھسیں۔ آگے پیچھے، بے ترتیب و بے مہار۔ اسے لدھارام کی دکان کے آگے بنا چھپر یاد آنے لگا۔ تب اس بزار کا رستہ سیدھا اور یکساں تھا۔ روز پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تو سڑک پر درخت کھڑے جھومتے رہتے۔ دو اطراف قائم دکانیں ایک دوسرے سے دور دور تھیں۔ اب کی مانند قبر کے کناروں کی طرح پسلیاں نہیں توڑتی تھیں۔ بزار کے اوپر نیلا آسمان دمکتا تھا۔ موتی کو چاچا محمد پناہ کے ہاتھ سے بنی گلقند والی چائے کی یاد آئی۔ وہ کبھی کبھی چائے پینے لدھارام والے چھپر کے نیچے آ ٹھیرتا۔ یہ چھپر جیسے دکان کا صحن تھا۔ اس میں پڑی بنچ پر کوئی نہ کوئی بیٹھنے والا دکان کے اندر موجود لدھارام سے حال احوال کر رہا ہوتا۔ سردیوں کی اُس شام جب وہ یہاں پہنچا، لدھارام ایک تغاری میں آگ جلوائے اپنے ہاتھ تاپ رہا تھا۔ ابھی موتی سے حال احوال ہو رہا تھا کہ آخوند صاحب آ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر موتی کی یادیں گڑبڑا گئیں۔ آخوند صاحب کا اصل نام اس نے یاد کرنا چاہا، مگر اس وقت اسے اپنا اصل نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہاں یہ یقین تھا، جیسے سارے اسے 'موتی' بلاتے تھے، شہر بھر انھیں 'آخوند صاحب' کہتا تھا۔ سن پینتالیس پچاس کے لگ بھگ۔ دبلے پتلے۔ لمبا سا قد۔ شانوں پر بکھری زلفیں اور بڑھائی ہوئی قلمیں۔ ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ۔ بوسکی کی قمیض اور سفید لٹھے کی شلوار۔ یہ تھے آخوند صاحب۔ ان کا کپڑا لتا، کھانا پینا سب شہر والے کرتے تھے۔ رہائش ڈاکٹر سبحان علی شاہ کے بنگلے میں۔ موتی کو یاد نہ آیا کہ آخوند صاحب کس کے بیٹے تھے۔ بس اسی بنگلے کی نچلی منزل میں آخوند صاحب کے ساتھ والے کمرے میں ڈاکٹر صاحب کی اسپتال تھی۔ ڈاکٹر صاحب اوپری منزل پر رہتے تھے۔ موتی کو یاد آیا، شاید ڈاکٹر سبحان شاہ کے بڑے یا چھوٹے بھائی ہوں۔ لیکن اس خیال پر موتی کو یقین نہ تھا۔ اور ہاں، ڈاکٹر سبحان شاہ تھے تو ڈاکٹر، مگر ان کی اسپتال میں ہمیشہ کمپونڈر بیٹھا ہوتا۔ ان کو اپنی اسپتال میں موتی نے کبھی بیٹھا نہ دیکھا۔ وہ اوپر

اپنے گھر پر ہی ہوتے۔ جب کوئی مریض آیا، کمپونڈر نے گھنٹی دبائی، ڈاکٹر صاحب اسی لمحے سیڑھیاں اتر آ پہنچتے۔ مریض دیکھ کر اس کی دوا درمل کرتے، اور پھر جھٹ سے اوپر چڑھ جاتے۔ مریض سے پیسے تک کمپونڈر لیتا رہتا۔ انھیں اپنی بیوی سے عشق تھا۔ اس کے بغیر رہ نہ پاتے۔ ان کو شہر بھر ''زال مرید'' کہتا۔ خود بولتے، ''کچھ سمجھ نہیں آتا، قبر میں اس کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا۔'' اپنے بڑے بیٹے کو وصیت کی ہوئی تھی، ''خبردار جوان ملا مولویوں کی بات پر میری قبر پکی بنوائی۔ یاد رکھنا، باہر نکل آؤں گا۔''

آخوند صاحب پر نظر پڑتے ہی سیٹھ لدھارام اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''سائیں، بھلی کرے آیا، بھلی کرے آیا!'' لدھارام نے اپنی کرسی خالی کر کے آخوند صاحب کو بٹھایا اور خود سامنے پڑی لکڑی کی بنچ پر جا بیٹھا۔

''ابا پٹ نور محمد۔ جا۔ جا بابا، ایک اور گلقند والی چائے بول آ۔ چاچا پناہ کو بتانا، خاص آخوند صاحب کے لیے ہے۔ ایسا کر، تو موتی اور میرے لیے بھی لے آ۔ دل کرے تو اپنے لیے بھی بول دینا۔ آج آخوند صاحب کے ساتھ ہم بھی عیش کرتے ہیں۔'' لدھارام نے دکان پر کام کرنے والے لڑکے کو روانہ کیا۔

''سائیں لدھارام، آج ارادہ کیا، تمھارے پاس آ کر تمھیں عزت دیں، اور دو باتیں بھی کر لیں گے،'' آخوند صاحب لدھارام سے بولے۔

''سائیں، آج تو قرب کر دیا آپ نے۔ میرے بھاگ سائیں!'' موتی کی یادداشت کی تختی پر وہ منظر صاف ابھر آیا۔ لدھارام کی باتیں سنتے آخوند صاحب ہلکی مسکان میں سر ہلاتے جا رہے تھے۔ لدھارام جھک کر آخوند صاحب کے قریب ہوا۔

''سائیں، دو دن پہلے ایک جوڑا خرید کر پریل درزی کو دے آیا تھا۔''

''ہاؤ لدھارام۔ خمیسو دھوبی کپڑے لایا تھا تو اس نے بتایا تھا بابا۔''

''سائیں وہی بوسکی۔ میں نے کہا، آپ کو اور کپڑا پسند نہیں۔ سائیں، میں خود لینے گیا تھا۔'' لدھا رام نے بات کی اخیر کرتے دونوں ہاتھ آخوند صاحب کے سامنے جوڑے۔

''اچھا کیا بابا لدھارام۔ اور سنا پٹ! تکلیف تو نہیں کوئی؟'' آخوند صاحب بیچ جملے میں موتی سے مخاطب ہوئے۔

"نہ ابا، نہ! آپ کے ہوتے ہمیں کوئی دکھ تکلیف پہنچے گی؟ خیر ہی خیر!'' موتی کے دونوں ہاتھ

جڑے تھے۔

''بابو سائیں، موتی بیچارے کی بات برابر ہے۔ آپ کے ہوتے ہمیں کیا فکر۔''

''ادا لدھارام، وہ شمشاد مٹھائی والے نے تمھاری اُدھار چکادی، بابا؟''

''آخوند سائیں، ادا شمشاد کے وعدے کو مہینہ اوپر ہوگیا ہے۔ پر سچ کہوں، مجھے حیا آتی ہے کہ اس سے پوچھنے جاؤں۔ ہوگا بیچارہ کسی مسئلے میں۔''

''میاں لدھارام، تم نے عزت داروں والی بات کی ہے۔ شمشاد کل میرے پاس آیا تھا۔ اس سے دیر سویر ہوگئی ہے۔ کہہ رہا تھا، اب تو مجھے تو ادا لدھارام کی دکان کے سامنے گزرتے شرم آتی ہے۔ ایک ہفتے میں چکادے گا بابا۔''

''نہ سائیں نہ! ہماری اپنی بات ہے۔ کیا میں، کیا ادا شمشاد! چھ بیسوں کی تو بات ہے۔ اور سائیں، کچھ دن پہلے وڈیرا بھورل آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ آپ اس کے بیٹے کی نوکری... ''لدھارام نے آدھی بات پر جملہ ختم کر دیا۔ موتی کو دکھ لگ گیا۔ وڈیرا بھورل آیا اور مجھ سے ملے بغیر چلا گیا! وڈیرے بھورل سے میل ملاپ کا چھوٹا بڑا منتظر رہتا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے شہر آتا تو گھوڑا مختیار کار آفیس میں باندھ کر پہلے ساری بزار کا چکر لگاتا۔ اور ہر ایک سے مل ملا کر، خیر خیریت دریافت کر کے، پھر اپنے کام دھندے کی فکر کرتا۔ اس کے حالی احوالی ہونے کا انداز اتنا نرم اور میٹھا تھا کہ موتی کو کبھی شمشاد مٹھائی والے کی جلیبیاں اتنی میٹھی نہیں لگیں۔ ویسے وڈیرے بھورل کا سارا گاؤں اپنی مثال آپ تھا۔ سب ... کے سب اشراف اور مہربان ہونے میں ایک دوجے سے بڑھ کر تھے۔ مگر وڈیرے بھورل سا بیٹا کوئی ماں کیسے جنے؟ وڈیرے بھورل کی شرافت اور مٹھاس پن کا واقعہ موتی کی گدلی آنکھوں میں پانی لانے لگا۔ ایک مرتبہ وڈیرے کے گھر ایک چور نے نقب لگائی۔ مٹی کی موٹی دیوار کو رنبے سے کھودتے کھودتے چور کو فجر ہوگئی۔ تب وڈیرا بھورل، جو یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، چور کو رسان سے بولا، ''ابا، اب تم جاؤ۔ اب تو سورج بھی نکلنے والا ہوگا۔'' بس چور روتا، دھاڑیں مارتا بھاگ نکلا۔ اسی شام کو وہ سارے خاندان سمیت معافی کے لیے آپہنچا۔ وڈیرا بھورل بھلا کیسے معاف نہ کرتا۔ اوپر سے کھانا وانا کھلا کر ان کے غ... حال پر اپنی بھوری بھینس بھی ان کے ساتھ کر دی تھی۔

''سائیں، وڈیرا بھورل تو ہم سے ملا ہی نہیں۔'' موتی اپنے الفاظ کو نکلنے سے روک نہ سکا۔

''ابا موتی، وڈیرے کے مہمان آئے تھے۔ وہ مہمانداری کا سامان لینے آیا تھا۔ بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ وڈیرا آئے اور کسی سے نہ ملے؟ تو بھی صفا چریا ہے۔''

''ہاؤ سائیں، بات تو حق کی ہے۔'' موتی ہلکا پھلکا ہوگیا۔ پھر اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ یہ وڈیرے بھورل کے بارے میں اس نے ایسے منھ پھاڑ کر کیسے بول دیا؟

''میاں لدھارام، اپنے بھورل کا بیٹا شہر پڑھ آیا ہے۔ اب ہم نے سوچا، اپنا بچہ ہے۔ اپنے اسکول میں اچھی پڑھائی کروائے گا۔ ہے کہ نہیں؟''

''سائیں بالکل بالکل۔ اس کی نوکری کب کروا رہے ہیں؟''

''لدھارام، اس کی نوکری ہوگئی ہے بابا۔ تمھیں سب پتا ہے، ڈی سی صاحب سے ہمارے کتنے واسطے ہیں۔ پر صرف ڈی سی کیا، اوپر تک ہماری پہنچ ہے۔ اب ڈی سی صاحب ہمیں کوئی جواب دیتا؟ پر نہ! ڈی سی صاحب اپنے ماسٹر منظور کا پرانا واسطے دار ہے۔ ہم نے سوچا، خود ڈی سی کے پاس چلے جائیں تو ماسٹر منظور سوچے گا، ہم نے اسے پھلانگ کر راہ بنالی۔ سو اس کو لے کر گئے تھے اور ماسٹری لے کر آگئے۔''

''وَہوا سائیں، وَہوا! سائیں، آفرین ہو۔ بڑا خیال رکھتے ہیں آپ اپنے شہر کا۔''

''لدھارام بابا، اپنا شہر ہے۔ ہمیں ہی کرنا ہے۔''

''سائیں برابر۔ غریب شاہوکار سب آپ کو دعائیں کرتے ہیں۔''

''کرنی بھی چاہییں بابا۔ یہ کام وام ایسے ہی آسان تھوڑی ہیں۔''

''صدقے صدقے! سائیں، میرا مالک مکان بھی بڑا نیک مرد ہے۔ سائیں اس پر بھی شفقت کی نظر۔'' موتی کے الفاظ دل سے نکل پڑے۔

''بابا موتی، ہم نے بھلا کبھی کوتاہی کی ہے؟''

''نہ بابا نہ! توبہ توبہ! ایسے نہیں سائیں۔ وہ ہمارا بڑا لحاظ رکھتا ہے۔''

''بابا لدھارام، اپنے موتی کو ہماری طرف سے آٹھ آنے دے دو۔''

''بابا! ویسے بھی آپ کا کھاتے ہیں،'' موتی آٹھ آنے لیتے ہوئے بولا۔ اتنے میں گلقند والی چائے بھی آگئی اور ساتھ ہوٹل کا مالک چاچا محمد پناہ بھی۔

''سائیں، لڑکا چائے لینے آیا تو بتایا کہ آخوند صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہ محمد پناہ بابا، نہ! آؤ بیٹھو۔ کوئی خیر خبر؟''

''سائیں آخوند صاحب، حال احوال سب خیر۔ وہ میونسپل والوں کو آپ نے کہہ دیا تو پھر وہ نہیں آئے۔ اور سائیں، حق انصاف کی بات تھی ان لوگوں کی۔ گلی میں بھینسیں باندھنے والا اپنا کام مجھے بھی ٹھیک نہیں لگا۔ بس گھر کے ساتھ باڑا بنوا رہا ہوں۔ بھینسوں کو وہاں رکھوں گا۔''

''کام تم نے اچھا سوچا ہے، محمد پناہ۔ پر میونسپل والوں کی بھی زور ازوری ہے۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے کہ عزت دار کے دروازے پر جا پہنچے۔ اگر ایسی بات ہے تو ہمیں کہیں۔ ہم کس لیے ہیں؟ ہم محمد پناہ کو سمجھا دیں گے۔ اپنا آدمی ہے، بھلا ہم سے باہر جائے گا؟ کیوں میاں لدھارام؟''

''ہاؤ سائیں! ہوتا تو ایسے ہے۔ ہمارے شہر کی ریت رواج بھی یہ ہے کہ کوئی مسئلہ معاملہ ہو، خانگی، سرکاری، سب آپ کے پاس آتا ہے۔''

''بس بابا، وہ بھی انسان ذات ہیں۔ کبھی ایسے، کبھی ویسے۔ خیر محمد پناہ، تم دل میں نہ کرنا بابا۔''

''نہ سائیں نہ! محمد پناہ دل میں برائی نہیں رکھتا آخوند صاحب۔''

موتی کا تصور اسے کڑھے ہوئے دودھ کی گاڑھی چائے میں گلقند کے تیرتے ذروں کی جانب لے گیا۔ اس کے منھ میں مٹھاس آگئی۔ تاوقتیکہ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کرسی کی پشت سے لگے سر کو اٹھایا، آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر جانچا، یہاں وہاں کچھ نہ تھا۔ لدھارام اپنی دکان گھر سمیٹ کر کب کا کہیں چلا گیا تھا۔ موتی کے پاس ندو لنگڑے کی طرح لدھارام کی بھی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ بس وہ دونوں سے یاد بہت آتے تھے۔ موتی نے کرسی گاڑی کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔ گاڑی لہراتے چلنے لگی۔ یہ لہراہٹ بھی کچھ دن پہلے کی تھی۔ مالک مکان مولابخش مرحوم کا بیٹا فضل تیسری بار کرایہ لینے آیا تب بھی موتی کے پاس کرائے کی رقم پوری نہ تھی۔ اب لوگ کہاں ہاتھ ڈھیلا کرتے ہیں۔ پورا دن مانگ مانگ، جھولی پھیلاتے پھیلاتے موتی نیم جان ہو جاتا، تب بھی شام تک اتنا تل نہ پاتا کہ اگلا سورج سکھ سے ابھرے۔ وہ دن گم ہو گئے جب شہر کے لوگ بزار سے گزرتے موتی کو روک کر دو آنے چار آنے دے جاتے تھے۔ کبھی موتی کو جلدی ہوتی تو دکان والے سے اگلے دن کا کہہ کر گاڑی آگے بڑھا جاتا۔ بس

دن راتوں میں بدل گئے۔ اب تو فضل نے کرایہ نہ ملنے پر موتی کی کرسی گاڑی اٹھا کر سڑک پر پھینک ماری۔ پھر موتی نے اپنے کفن دفن کے لیے رکھی رقم سے پیسے نکالنا ضروری سمجھا۔ کرایہ تو پورا ہو گیا مگر گاڑی میں لہراہٹ آ گئی۔ بزار کے اوپر ٹنگے ترپالوں اور شامیانوں کے پھٹے سوراخوں سے روشنی کے لہریے بزار میں اترنے لگے۔ جمعدارنیاں اور جمعدار لمبے لمبے جھاڑو سنبھالے سڑک بہارنے شروع ہو گئے تھے۔ جھاڑوؤں کی زرد تیلیاں جمعداروں کے چہروں کی طرح ست ست بے جان انداز میں اِدھر اُدھر رینگ رہی تھیں۔ کمیٹی جانے والے گند کے درمیان گزرتے موتی نے گرد و غبار کے ذروں کے دھند ھلکے میں ''بخشل کلاتھ اسٹور'' کا بورڈ دیکھا۔ ٹین کی چادر کے بورڈ پر سرخ حرفوں میں بڑے بڑے الفاظ۔ اس دکان سے ایک ہفتہ پہلے موتی کو دھکے اور گالیاں پڑی تھیں۔ صبح کا وقت تھا اور ہمیشہ کی طرح اس نے دکان کے سامنے آواز لگائی تھی۔ ''سائیں کا خیر، بادشاہ کا خیر! بابا اللہ کے نام پر موتی مجبور کو روپیہ دو۔'' بس دکان کا مالک عبدالجبار دکان کی سیڑھیاں اترتا، گالیاں دیتا آیا۔ ''ابھی کوئی گراہک نہیں آیا اور یہ حرامی آ مرا۔ نکل یہاں سے بے غیرت! ہم نے تمھارا ٹھیکہ لیا ہوا ہے؟'' اپنا قصور موتی کی سمجھ میں نہ آیا اور عبدالجبار کی غصے میں بند ہوتی آنکھوں اور منھ پر پڑتی جھریوں کی وجہ بھی وہ سمجھ نہ پایا۔ یہ عبدالجبار چاچا حسن کا بیٹا تھا۔ جب چاچا حسن اس دکان پر ہوتا تھا تب یہ چھوٹی سی دکان تھی۔ موجودہ دکان کا ایک تہائی۔ سفید ڈاڑھی والا چاچا حسن اس پر بیٹھا ہنستا رہتا۔ بچوں کو وہ ہمیشہ ''او تمھاری نانی مر جائے، کیا چاہیے تمھیں؟'' کہا کرتا تھا۔ اس کی دکان پر ناس نسوار سے بیڑی اور تمباکو تک، پراندوں سے لے کر ٹوپی میں کاڑھے جانے والے شیشوں اور موتیوں تک، آٹے دال سے تیل صابن تک ہر چیز مل جاتی تھی۔ شہر کا قریب ہر فرد ماما حسن کا گاہک تھا۔ اور صرف گاہک نہیں بلکہ قرضی بھی۔ کیا مرد کیا عورت۔ عورتیں بزار نہ آسکنے کی صورت میں بچے کے ہاتھ مکھیاری ''دیکھنے اور پسند کرنے کے لیے'' چیزیں منگوا لیتی تھیں۔ جو پسند نہ آتی، واپس پہنچ جاتی۔ پیسے کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ بس ضرورت ہونی کافی تھی۔ بھلا کوئی آج تک پیسے ساتھ لے گیا؟ اگلے چاند یا اگلی فصل پر چاچا حسن کو پیسے پہنچ جاتے۔ موتی اور نندو لنگڑے تو روز کسی نہ کسی وقت اس کے ہاں پہنچ جاتے۔ پھر ان کا مذاق ہوتا۔ بڑا پد مارنے کا مقابلہ ہوتا، جس میں چاچا حسن ان سے ہمیشہ جیت جاتا۔ موتی اور نندو لنگڑا چاند کے چاند ایک ایک بیسا چاچا حسن کے پاس رکھوا دیتے۔ پھر ان پیسوں سے کبھی صابن تیل، کبھی نسوار بیڑی، کبھی

موم بتی تو کبھی چاول یا چینی لیتے رہتے۔ موتی کو لگتا تھا، چاچا حسن سے ایک دو روپے کی چیزیں زیادہ ہی لے لی ہیں، مگر چاچا ان سے حساب کہاں کرتا؟ کبھی تو یوں بھی ہوا کسی مجبوری میں چاچا حسن سے پیسے مانگنے جا پہنچے اور اس نے دو چار روپے نکال کر رکھ دیے۔ ''بھئی سب پیسے امانت ہیں۔ چاہو تو سارے لے جاؤ۔'' چاچا حسن کی یاد پر موتی کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک کر خالی جھولی میں آ ٹپکے۔ اسے پھر خیال ستانے لگا، یہ سب کچھ یکا یک بدل کیسے گیا؟ کاش ''یکا یک'' اس شہر میں بدروح کی طرح نہ اترتا۔ اس کی سوچوں میں غمزدگی ہر بند کو توڑنے لگی۔ انگنت دائرے طواف کی ابتدا کرنے لگے۔ اختتام ہنوز منتظر۔

موتی کی کہانی ابھی جاری ہے مگر نندو لنگڑے کی کہانی اختتام تک پہنچ چکی ہے۔ یہ تب ہوا جب بہت پہلے ایک شام، جس وقت سورج اپنا وجود خاتمے کی نذر کرنے لگا تھا، اس وقت نندو لنگڑا تانگا اسٹینڈ کے پاس گزر رہا تھا۔ اسی چال میں۔ مٹکتا، جھٹکے لیتا۔ اس نے چار دیواری سے عاری تھانے کی پیلی عمارت کے آگے منظر دیکھا تھا اور اس منظر نے اسے وہیں گاڑ دیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی پر ٹاہلی کے نیچے، تھانے کے سامنے، باہر سے آنے والا نیا تھانیدار ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ آخوند دریانومل صاحب اس تھانیدار سے ملنے ملانے گئے تھے۔ معمول کی طرح یہی کہنے اور سمجھانے، شہر میں کوئی فساد، جھگڑا یا جرم ہو، آپ کو کسی کارروائی کی ضرورت نہیں۔ بس آخوند صاحب کو آگاہ کر دیں۔ وہ خود سنبھال لیں گے۔ اور وہ سنبھالتے رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی باہر سے آنے والا تھانیدار غضبناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور وہ آخوند دریانومل صاحب کی زلفوں کو پکڑے ایک دو تھپڑیں جڑنے کے بعد سیفٹی ریزر سے آخوند صاحب کی زلفیں مُنڈوا رہا تھا۔ نندو لنگڑے نے باہر سے آنے والے تھانیدار کی پھنکارتی آواز سنی تھی۔ ''تُو ہندو ہو کر ہم پر حکم چلاتا ہے؟ ہمیں نوکر سمجھ رکھا ہے کیا؟ ہاں؟ تیرے باپ کا راج ختم ہو گیا یہاں۔ سمجھے؟ بہت ہو گیا۔ نکل یہاں سے اور اپنے سگوں کے ملک جا۔ وہاں جا کر یہ کنجرپن چلانا۔'' تب نندو لنگڑے نے اپنے آپ کو وہاں سے آزاد کیا اور موتی کو خبر کیے بغیر چل نکلا۔ ہو سکتا ہے اس نامختتم ''یکا یک'' کا یہی آغاز ہو۔ ہو سکتا ہے نہ ہو۔ بھلا نندو لنگڑے جیسے بے وفا شخص کا کیا اعتبار۔

❋❋

زرد ہتھیلی

جنوری کے ابتدائی دن تھے اور سردی اپنے زوروں پہ تھی۔ رات کے آخری پہر میں مدرسے کی عمارت اور چار دیواری میں گھرے صحن پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف حفاظ کا کمرہ روشن تھا جہاں بچوں کی کثیر تعداد، رحلوں پر پاک کتاب سامنے رکھے، ایک توازن کے ساتھ جسم کو آگے پیچھے جھلاتی، زور زور سے سبق دہرائے جا رہی تھی۔ گیارہ سالہ اسداللہ اس روشن کمرے کے بند دروازے کے باہر کھڑا، خوف میں جکڑا، دروازے کی نچلی درزن سے پھوٹتی روشنی کی باریک لکیر کو بے دھیانی میں دیکھے جا رہا تھا جس سے صحن کے اندھیرپن میں ہلکی سی روشنی مٹی پر رینگ رہی تھی۔ آج صبح پانچ بجے عبدالحمید، جو حافظوں کے استاد قاری گل شیر قاری کا خلیفہ اور باقیوں کے لیے نائب استاد تھا، کمرے میں انھیں جگانے آیا تو اسداللہ کو اٹھتے ہوئے پھر نیند نے گھیر لیا۔ پسلی پر لگنے والے ٹھڈے نے اس کی بند آنکھیں کھول دیں اور وہ اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکا۔

''کنجر کی اولاد، تو پھر سو گیا! وہاں سبق تیرا باپ سنائے گا؟'' خالی کمرے میں عبدالحمید اس کے اوپر کھڑا بھیڑیے کی طرح غرّا رہا تھا۔ وہ اٹھا اور رضائی کو ایک طرف پھینک کر وضو کرنے کے لیے بھاگا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے قاری کے دروازے کے باہر آ کھڑا ہوا تھا جہاں مار کے ڈرنے اس سے سخت سردی کا اثر بھلایا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے کا ارادہ کرتے ہوئے اسے ہول آ رہا تھا مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جتنی زیادہ دیر ہوگی اسی قدر اسے مار کٹائی کی جائے گی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے دروازے کو ہلکے سے دھکیلا۔ ''چرّوں'' کی آواز ابھری اور دروازے کا پٹ کھل گیا۔ اندر دو بلبوں کی زرد روشنی میں اکھڑی رنگت والی پیلی دیواروں کے ساتھ تین طرف قطار میں بیٹھے حافظ اپنی اپنی رحلوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اسداللہ کو دیکھتے ہی قاری گل شیر، جو قصاب کی عرفیت سے مشہور تھا، اٹھا اور اسداللہ کے گریبان سے پکڑ کر اسے گال پر زور سے طمانچہ مارا۔ اسداللہ کا دماغ گھوم گیا۔ جب دوسرا طمانچہ لگا تو وہ تیورا کر کھجور کی چٹائی پر جا پڑا۔

"حرامزادے... بے غیرت! ہم تیرے نوکر ہیں کہ لاٹ صاحب کو اٹھانے کے لیے بار بار لڑکا بھیجیں! اگلی بار دیر کی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" قاری گل شیر کی باچھوں سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اسداللہ ایک بھی آواز نکالے بغیر فرش سے اٹھا اور طاقچے میں پڑا اپنا قرآن اور رحل اٹھا کر پڑھنے میں لگ گیا۔ قاری کی مار میں درد اور اذیت سے چیخنا سب سے بڑا جرم تھا۔ رونے کی ذرا سی آواز سن کر بھی قاری آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

"مکر کرتے ہو؟ میرے سامنے مکر کرتے ہو؟ یہ مکر جا کر اپنی ماں کو دکھایا کرو!" کہتے ہوئے قاری لکڑی کے بید کے ساتھ رونے والے پر شروع ہو جاتا اور جب بید ٹوٹ جاتی تب ہی جا کر جان چھوٹتی۔ میانہ قد، تیل میں چپڑے پٹے دار بال اور سیاہی مائل سانولی رنگت والے حافظ گل شیر سے پورا مدرسہ لرزتا تھا۔ حافظ تو حافظ، درس نظامی کے طلبا بلکہ مدرسہ کے باقی اساتذہ بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ سب کہتے تھے کہ قاری گل شیر کے جسم میں خون کی جگہ سیاہ سانپ کا زہر گردش کرتا ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر اذیت ناک سزائیں دینا اس کا معمول تھا۔ پڑھائی پر غیر حاضر رہنے یا دیر سے آنے والوں کو لٹا کر ان کے ہاتھ پاؤں کو چار شاگردوں سے جکڑواتا اور پھر بید سے پاؤں کے تلوے مار مار کر سرخ کر دیتا۔ سبق یاد َور کچا ہونے پر وہ شاگرد کو اپنے سامنے پڑی فرشی ڈیسک پر الٹا لٹاتا اور قمیص اوپر کر کے چوتڑوں پر اتنے ڈنڈے برساتا کہ بچے سے پورا دن بیٹھا نہ جاتا۔ معمولی سی غلطیوں پر بھی کبھی وہ بچے پر رحل آزمانے لگ جاتا تو کبھی کسی کو دھوبی پاٹ سے پٹخ رہا ہوتا۔

الغرض اذیت ناک سزائیں دینا قاری کا پیشہ تھا، مگر اس کے باوجود وہ صدر مدرّس کا چہیتا تھا اور کسی کو اسے ایک حرف کہنے کی اجازت تک نہ تھی۔ صدر مدرّس ہر جگہ اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتا کہ حافظ گل شیر کے شاگردوں کا پورے علاقے میں شہرہ تھا۔ قرائت میں یکتا حافظ گل شیر کے تیار کیے ہوئے شاگردوں کا آس پاس کے کسی بھی مدرسے میں ثانی نہ تھا۔ دور دور سے لوگ قاری گل شیر کے پاس اپنے بچے حفظ کے لیے چھوڑنے آتے تھے۔ اسداللہ کو بھی اس کا والد پچاس میل دور گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اسداللہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا اور اپنا سبق دہرانے لگا۔ پانچ شاگردوں کے بعد اس کے سبق سنانے کی باری تھی۔ اسداللہ کو سبق دہراتے پھر نیند گھیرنے لگی۔ اگرچہ قاری کے طمانچوں کا اثر باقی تھا مگر اسداللہ نیند سے کی وجہ سے اکثر قاری کی مار کا شکار بنا رہتا

تھا۔ اسے نیند بے بس کر دیتی تھی۔ اٹھتے وقت آنکھیں کھلنے سے انکاری ہو جاتی تھیں۔ وہ بار بار پیشاب کا بہانہ لگا کر آنکھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھوتا اور پوری کوشش کرتا کہ اندر پتلیوں میں پانی چلا جائے، اور یوں کچھ دیر کے لیے اس کی نیند بھاگ جاتی مگر پڑھائی پر بیٹھنے کے بعد پھر اس کی آنکھیں آپے آپ بند ہونے لگتیں۔ اس کے سر نے نیند سے مجبور ہو کر ایک جھولا کھایا تو قاری کی تیز نظر اس پر پڑ گئی۔ قاری نے ڈیسک پر رکھے ہوئے اپنی چابیوں کے گچھے کو اٹھا کر زور سے اسد اللہ کے منہ پر پھینک مارا۔ گچھا اسد اللہ کے منہ سے جا ٹکرایا۔ الماری کی بڑی چابی کا دندانہ لگنے سے آنکھ کے نیچے سے خون کی بوند رس آئی۔ مضروب گال والے اسد اللہ کو اب چابی واپس ڈیسک پر جا کر رکھنی تھی۔ اس نے اپنے میلے اجرک کے پلو سے رستا ہوا خون صاف کیا اور لرزتا ہوا چابی واپس رکھنے کے لیے اٹھا۔ اس کے جسم کی حالت اس نازک تنے والی جھاڑی کی طرح تھی جو سبع پتھریلے میدان میں سخت تیز ہوا کا سامنا کرتی ہے۔ چابیوں کا گچھا رکھ کر واپس پلٹا تو قاری نے ایک زوردار بید اس کے چوتڑوں پر رسید کیا۔ چوٹ کی تکلیف سے وہ بے اختیار چند قدم دوڑتا چلا گیا۔ اسد اللہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ اس نے سوچا کہ وہ دروازہ کھول کر یہاں سے بھاگ جائے، مگر اسے یاد آیا کہ پچھلے ماہ یہاں سے بھاگ جانے پر اس کا کیا حشر ہوا تھا۔

پچھلے ماہ کی دوسری جمعرات کو اسد اللہ نے گھر گھر جا کر روٹی اور سالن جمع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مدرسے میں سب شاگردوں کی باریاں مقرر تھیں۔ تین ٹولیوں میں دو دو طالب دونوں وقت سر پر بڑا تھال رکھ کر گلیوں میں نکل جاتے اور ہر گھر سے دو روٹیاں اور سالن جمع کر کے مدرسے لے آتے۔ یوں مدرسے کے طالبوں کا دو وقت کھانا ہو جاتا۔ اسد اللہ جب سر پر تھال اٹھا کر گلیوں میں کھانا جمع کرنے نکلتا تو اسے یوں لگتا جیسے دنیا کھڑی ہو کر اس کی ذلت کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ وہ آنکھیں زمین میں گاڑے دوسرے طالب کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے چلتا رہتا۔ گھر میں اکثر عورتیں ہوتی تھیں جو انھیں بغیر پوچھے دو روٹیاں اور تھوڑا سا سالن دے دیتیں۔ یہاں تک تو وہ برداشت کر ہی لیتا تھا مگر چاچا الیاس کے دوکان کے سامنے سے گزرتے جب چاچا بلند آواز میں کہنے لگتا: ”تمھیں شرم نہیں آتی، بھک منگوں کی طرح در در پر جا کر مانگتے ہو! نہ تمھیں حیا ہے نہ تمھارے ماں باپ کو۔“ تب اسد اللہ کا جی چاہتا کہ وہ خود کو کسی ٹرک کے نیچے دے دے۔ تنگ آ کر اس نے روٹی

مانگنے کو جانے سے حمید سومرو کو جواب دے دیا۔ حمید نے بغیر کسی دیر کے قاری کو اسد اللہ کی بغاوت کی اطلاع کر دی۔ قاری یہ سنتے ہی آپے سے نکل گیا اور اسد اللہ کو بلا کر بے دریغ مارا۔ لکڑی کے تین ڈنڈے توڑنے کے بعد جب اس نے اسد اللہ کی جان چھوڑی تب اس کا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ اس دن ظہر کے بعد اسد اللہ گاؤں جانے والی بس پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ روتا کراہتا گھر میں داخل ہوا اور ماں کی نظر اسد اللہ کے پھول جیسے جسم پر لگی چھڑیوں کے خون آلود نشانوں پر پڑی تو وہ غش کھا کر گر گئی۔ بیٹے کے زخموں کی مرہم ٹکور کرتے ہوئے اس نے پکا عہد کر لیا کہ اب کی بار وہ اسد اللہ کو مدرسے جانے نہیں دے گی، چاہے منظور احمد اسے مار ڈالے۔ منظور احمد جوں ہی گھر آیا تو زہرا بتول نے اسے بیٹے کا حال سنایا۔ منظور احمد بیٹے پر ہونے والے ظلم پر پسیجنے کے بجائے آگ بگولا ہو گیا۔

''تُو مدرسہ چھوڑ آیا ہے، خبیث؟'' آتے ہی اس نے بیٹے پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اسد اللہ تھپڑ کھا کر مزید سہم گیا۔

''میاں، تم اس کی حالت نہیں دیکھ رہے؟'' ماں لپک کر آگے آئی۔ ''دیکھو تو سہی، ظالم نے اس کا کیا حال کیا ہے؟'' زہرہ اسد اللہ کے پیٹھ سے قمیض اٹھا کر منظور احمد کو دکھاتے ہوئے رو پڑی۔

''یہ تمھارے ہی بدخون کا اثر ہے جو یہ مدرسہ چھوڑ آیا ہے۔ میرا بیٹا ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔ اور تم اسے ہدایت کرنے کے بجائے اس کا دماغ خراب کر رہی ہو؟'' منظور احمد کا لہجہ سدا کی طرح زہریلا اور ذلت آمیز تھا۔

''میاں، تم کچھ بھی کہو، میں اب کی بار اسے مدرسے جانے نہیں دوں گی۔'' مضبوط لہجے میں بولتی زہرہ کا جملہ جوں ہی منظور تک پہنچا، اس نے اس کے غصے کو آسمان پر چڑھا دیا۔

''لگتا ہے تمھارا ٹوٹا بازو جڑ گیا جو زیادہ بھونک رہی ہو۔''

زہرہ کو اپنی ٹوٹی کلائی یاد آئی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا بیٹے کو مدرسے نہ بھیجنے والا مضبوط عزم کمزور پڑنے لگا۔

''میاں جی، تم دیکھو تو سہی۔ کوئی بچے کو اس بے رحمی سے مارتا بھی ہے؟''

"او جاہل عورت! اپنا منھ بند رکھ۔ استاد کی مار بچے کے لیے ماں باپ کے پیار سے بڑھ کر

ہے۔ اسی مار سے ہی بچہ بنتا ہے۔ جہاں جہاں استاد کی لاٹھی لگتی ہے وہاں بچے کو دوزخ کی آگ حرام ہے۔ میں کل اسد اللہ کو چھوڑ آؤں گا۔'' وہ رات اسد اللہ اور زہرہ کے لیے بہت بھاری تھی۔ ماں سے لپٹ کر سویا ہوا اسد اللہ وقفے وقفے سے رو پڑتا۔

''ماں، مجھے بچا لو۔ قاری مجھے مار دے گا۔'' ماں کی سسکیاں نکل جاتیں اور اس کا دل دھڑکنا بند کر دیتا مگر وہ اتنی بے بس تھی جتنی عورت پیدائش سے لے کر مرنے تک ہوتی ہے۔ صبح کو جب منظور احمد اسد اللہ کو گھسیٹ کر لے جانے لگا تو اسد اللہ کا رونا ماں تک پہنچ کر اس کا سانس بند کیے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کلیجے پر کانٹے گھسیٹے جا رہے ہوں۔ زہرہ نے دوڑ کر اپنا دوپٹہ منظور احمد کے پاؤں میں رکھ دیا مگر منظور احمد دوپٹے کو روندتا ہوا گزر گیا۔ اس نے چاہا کہ اپنے بیٹے کو پکڑ لے اور اسے جانے نہ دے، مگر پچھلے تجربے کی دھمک اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔

اسد اللہ نے جیسے ہی پانچویں پاس کی تو اس کے باپ نے اسے مدرسے میں داخل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ زہرہ کو پتا چلا تو دھک سے رہ گئی۔ مڈل پاس زہرہ نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا ہوا تھا۔ اس کو دو بیٹیوں کے ساتھ صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کے لیے وہ پہلی بار شوہر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''منظور احمد، میں نے آج تک شکایت نہیں کی، کچھ نہیں کہا۔ مگر میں اپنے بیٹے کو مدرسے داخل نہیں کرواؤں گی۔ اسے میں پڑھاؤں گی، ڈاکٹر بناؤں گی۔''

راج مستری منظور احمد بیوی کی زبان کھلتے دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔

''بے حیا، بے غیرت! شوہر کے سامنے زبان کھولتی ہے؟ یہ تیرے منہ میں کس نے زبان پیدا کی ہے؟ اور یہ تو نے کب سے سمجھ لیا کہ اسد تیرا بیٹا ہے؟ کبھی عورت کی نسل چلتی دیکھی تو نے؟ نسل مرد کی ہوتی ہے، مرد کی!'' منظور احمد گرجنے لگا۔

''منظور احمد، تو بھی سن لے! میں نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا ہے۔ میں اسے مدرسے میں داخل کرنے نہیں دوں گی۔''

منظور احمد زہرا کی بات سن کر تیلی کی طرح بھڑک اٹھا۔

''تو مجھے روکے گی؟'' منظور غصے میں بھرا آگے آیا۔ ''تو مجھے روکے گی؟''

''ہاں، میں تجھے روکوں گی۔''

منظور نے زہرہ کی چوٹی پکڑ لی۔

''مجھے روک کر دکھا!'' یہ کہتے ہوئے اس نے زہرہ کی چوٹی کھینچ کر دوہرا کرتے ہوئے اس کی گدی پر زوردار ہاتھ مارا۔ ''تو مجھے روک کر دکھا!'' اس نے زہرا کو لات ماری۔ منظور کا بوٹ زہرا کے گھٹنے پر لگا۔ زہرا کو شدت کا درد ابھر آیا۔ ابھی تک اس کی چوٹی منظور کے ہاتھ میں تھی ورنہ وہ زمین پر بیٹھ جاتی۔

''اس کا سامان تیار کر! میں اسے کل لے جاؤں گا۔ اور اگر اب تو نے ایک حرف بھی زبان سے نکالا تو تجھے زندہ گاڑ دوں گا۔'' منظور احمد نے زمین پر تھوکا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

باپ کے جاتے ہی اسد اللہ اور اس کی بہنیں عابدہ اور ماجدہ ماں کے ساتھ آ لپٹے جو زمین پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ سہمے ہوئے بچے جیسے ہی ماں کے قریب آئے تو اس نے اسد اللہ کو دونوں بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے دل نے چاہا، کاش وہ اپنے بیٹے کو دوبارہ اپنی کوکھ میں چھپا سکے۔ اس رات چارپائی پر بیٹھے منظور احمد کے سامنے اس نے روٹی رکھی اور خود پائینتی کی طرف ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس پکڑے بیٹھ گئی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ منظور احمد کھانے کے دوران اور آخر میں پانی کے دو گلاس پیتا تھا۔ زہرا، ہاتھ میں گلاس تھامے، منظور احمد کے ہنکارے کی منتظر رہتی۔ جیسے ہی منظور احمد ہنکارا بھرتا، جھٹ سے گلاس آگے بڑھا دیتی۔ منظور احمد نے کھانا ختم کر کے انگوچھے سے ہاتھ پونچھے اور ہنکارا بھرا۔ زہرا نے پانی کا دوسرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''منظور احمد، میں نے عمر بھر تم سے کچھ نہیں مانگا۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، میرے بیٹے کو مجھ سے دور نہ کرو۔ میں اسے اسکول پڑھاؤں گی۔''

منظور احمد کا منہ ابھی پانی کے پہلے گھونٹ سے بھرا تھا۔ اس نے منہ میں بھرے پانی کو کلی کیا اور گلاس کا باقی پانی زہرا کے منہ پر پھینک دیا۔ زہرا کا منہ، گریبان اور دوپٹہ بھیگ گیا۔ وہ اٹھی اور چارپائی سے دور کھڑی ہو گئی۔

''میں آخری بار کہتا ہوں کہ یہ بات دوبارہ تیرے منہ سے نہ نکلے، ورنہ تو مجھے جانتی ہے!'' انگلی اٹھا کر دانت بھینچتا منظور احمد غصے سے ابل پڑا اور وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ بھلا منظور احمد کو اس سے

زیادہ کون جانتا ہوگا! وہ اکثر اس کے ہاتھوں مار سہتی رہتی اور اس کے ڈر میں مبتلا رہتی۔ صبح سویرے جب منظور سر پر سامان کی جستی پیٹی رکھے اور ہاتھ میں اسداللہ کو پکڑ کر جانے لگا تو زہرا بے اختیار اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس کی ساری دنیا اس سے چھینی جا رہی تھی۔

''منظور احمد، تجھے تیری مری ہوئی ماں کا واسطہ، میرے بیٹے کو نہ لے جا!''

منظور احمد نے اپنی ٹانگیں چھڑائیں اور صحن کے کونے میں بنے چولھے کے قریب رکھی ہوئی پھکنی اٹھالی۔ پھکنی کے تین چار وار زہرا کی کمر پر پڑے۔ درد کی شدت نہ سہتے ہوئے زہرا نے اگلے وار سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آگے کیے، تب لوہے کے پائپ سے بنی پھکنی کا زوردار وار اس کی کلائی پر پڑا اور ہڈی پر ضرب کی آواز شیشے کی بنی چوڑیوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ابھری۔ ''ہائے میں مرگئی!'' کہتے زہرا اپنی ٹوٹی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر بے دم ہوگئی۔ اگر اس کے اندر عورت کی مرد سے زیادہ تکلیف برداشت کرنے کی فطری صلاحیت نہ ہوتی تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ آج بھی اسداللہ کو گھسٹتے دیکھ کر منظور کو روکنے کے لیے بے اختیار ہوئی جا رہی تھی مگر کلائی ٹوٹنے کے درد نے اس کو زنجیریں ڈال دی تھیں۔

اسداللہ کو قاری کے حوالے کرتے منظور احمد نے ''قاری جی، گوشت آپ کا اور ہڈیاں ہماری'' کہا اور واپس روانہ ہوگیا۔ قاری گل شیر، جو منظور احمد کو دیکھ کر اس کے ردعمل کا سوچ کر پریشان ہوگیا تھا، یہ بات سن کر مطمئن ہوگیا۔ جیسے ہی منظور احمد نے مدرسے کے گیٹ سے پاؤں باہر رکھا، قاری نے مدرسے کے احاطے میں لگے شریںھ کے درخت سے اسداللہ کو سرتا پاؤں رسیوں میں جکڑا اور بجلی کی پی وی سی وائر لے کر اس پر شروع ہوگیا۔ کل کی مار کھایا ہوا اسداللہ، جس کے جسم پر لگے زخم ابھی سوجے ہوئے تھے، تڑپنے سے معذور حالت میں چیخنے لگا۔ صحن میں پھرتے اور کمروں کے دروازوں پر کھڑے سب طالب سہم کر اپنے اپنے کمروں میں غائب ہوگئے۔ جمعہ نماز کی تیاری کرتے ہوئے مدرسے کے صدر مدرس مولانا عبدالوحید نے آکر جب قاری گل شیر کو روکا تب تک اسداللہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ قاری گل شیر کو لے جاتے ہوئے مولانا عبدالوحید نے دورۂ حدیث کے دو طالبوں کو اسداللہ کے کھولنے کو کہا۔ تین دن تک اسداللہ سے بیٹھا یا سویا نہ جاتا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے رات کا اکثر وقت روتے گزار دیتا۔ ماں بہت شدت سے یاد آتی مگر گاؤں جانے کی سوچ ہی اس کے

قریب نہ آتی تھی۔

اس دن کے بعد اسد اللہ نے بولنا کم کر دیا۔ پڑھائی کے بعد کمرے یا مسجد میں چپ بیٹھا خلا میں تکتا رہتا۔ عصر نماز کے بعد جب مغرب تک طالب کھیلتے رہتے، وہ مسجد کے ایک کونے میں ستون سے ٹیک لگائے چپ بیٹھا رہتا۔ دن گزرتے گئے۔ اسد اللہ حفظ کرتا رہا۔ مار سے خوفزدہ اسد اللہ حفظ کرنے میں سب سے آگے تھا۔ اس کی اعراب یا مخرج کی ایک غلطی بھی نہیں نکلتی تھی۔ قاری گل شیر کی مار اور شاگردوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ مدرسے بھر میں حافظوں کے کمرے کو جہنم کے ٹکڑے سے پکارا جاتا اور حافظوں کے علاوہ باقی طالب اس کے قریب گزرنے سے بھی پرہیز کرتے۔ سارے حافظ دن بھر خوف کے قیدیوں کی طرح جھولتے اور پڑھتے رہتے۔ انھیں صرف جمعرات کی آمد زندہ رہنے میں مدد دیتی۔ دراصل قاری کا معمول تھا کہ وہ ہر جمعرات اپنے گاؤں چلا جاتا اور جمعے کی شام واپس ہوتا۔ جمعرات کی دوپہر ہونے لگتی تو حافظ اس تانگے والے کا انتظار کرنے لگتے جو قاری کو اس کے گاؤں لے جاتا تھا۔ جیسے ہی قاری گل شیر کو لے جانے والا تانگہ نظروں سے اوجھل ہوتا، حفاظ خوشی سے بے قابو ہو جاتے۔ مدرسے کے صحن اور اور کمروں میں دوڑیں لگ جاتیں اور حافظوں کو روکنا دشوار ہو جاتا۔ جمعرات کی شام اور جمعے کی صبح مدرسے کے در و دیوار میں خوشی اور شوخی لہراتی رہتی۔ حافظ تو حافظ، درسِ نظامی والے بھی مدرسے کے احاطے میں شور وغوغا اور کھیل کود میں جتے رہتے۔ جیسے ہی جمعے کی شام کا وقت آنے لگتا، خوف اور سناٹا ایک بار پھر مدرسے کو اپنے گھیرے میں لینا شروع کر دیتا۔ قاری گل شیر کی آمد کا وقت قریب ہوتے ہوتے حافظوں کے سہمے ہوئے دل مسوتے جاتے۔ عصر کے بعد سب حافظ مدرسے کے باہر قطار میں بیٹھے اس راستے کو تکتے رہتے جہاں سے قاری گل شیر کا تانگا آتا تھا۔ جیسے ہی موڑ مڑتے ہوئے تانگا قاری گل شیر کو لیے ظاہر ہوتا، وہ سب کے سب اٹھ کر کمروں میں دوڑ جاتے۔ اسد اللہ بھی اپنے بستر میں منھ دے کر رونا شروع کر دیتا اور دل ہی دل میں خدا سے شکوے شروع کر دیتا۔ اسد اللہ ہر جمعرات اور جمعہ، دونوں دن بس یہی دعا مانگتا رہتا کہ قاری گل شیر کا تانگا الٹ جائے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے تاکہ کچھ دن اسے نجات مل سکے، مگر اس کی یہ دعا کبھی قبول نہ ہوئی۔ ہر ہفتے وہ خدا کے سامنے رو رو کر التجائیں کرتا اور آس باندھتا رہتا مگر عصر کے بعد جب تانگا نمودار ہوتا تب پھر اسے اپنی دعا سے اعتبار اٹھ جاتا۔ وہ ٹوٹا دل لے کے چھ

دن کے لیے پھر سے پڑھائی میں جت جاتا۔ قاری گل شیر آتے ہی حمید سومرو کو طلب کر کے رپورٹ لیتا۔ رپورٹ سننے کے بعد مجرموں کو سزائیں دی جاتیں۔

رمضان آیا تب تک دس ماہ میں اسد اتیرہ پارے حفظ کر چکا تھا۔ ستائیس رمضان کو قاری گل شیر کے ختم شریف پورے کرنے کے بعد حافظوں کو عید کی دس دن چھٹی دی گئی۔ باقی سارے طالب پندرہ شعبان کو ہی گھر جا چکے تھے۔ اسد اللہ بھی تین ماہ کے بعد گھر جا پہنچا۔ مدرسے میں داخلے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اسے اکٹھے اتنے دن گھر رہنے کو ملا تھا ورنہ ہر دوسرے تیسرے ماہ صرف دو دن گھر آنے کی اجازت ملتی۔ اسد اللہ کے گھر پہنچنے کی اس سے زیادہ اس کی ماں زہرا بتول کو خوشی تھی۔ وہ اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھی۔ بار بار اسد اللہ کو بھینچ بھینچ کر کلیجے سے لگاتی مگر اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ اس نے اسد اللہ کی پسند کے گڑ والے چاول بنائے اور دوسرے دن مرغ ذبح کروایا اور چاولوں کی روٹی بنائی۔ وہ بیٹے کو گود میں بٹھائے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر کھلاتی جاتی۔ اسد اللہ کے ذہن پر چھایا قاری گل شیر کا خوف ہوا ہو چکا تھا اور وہ گلیوں کھیتوں میں دوستوں کے ساتھ کھیلتا اڑتا پھرتا تھا۔ عید کی رات جب اس کی ماں عابدہ اور ماجدہ کو مہندی لگانے لگی تو اس نے بھی ضد کر دی۔ ماں نے ان دونوں کو چھوڑ کر اس کی ہتھیلیوں کے بیچ میں لال مہندی سے پورا گول دائرہ بنا دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس کی کومل ہتھیلیوں کے بیچ لال سورج دہک رہے تھے۔ عید کے تیسرے دن جب وہ شام کے جھٹپٹے میں اپنی بہنوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے صحن میں دوڑیں بھر رہا تھا تب اس نے اپنے باپ کی آواز سنی:

''اسد اللہ کا سامان ٹھیک کر دو۔ میں کل صبح اسے مدرسے چھوڑنے جاؤں گا۔''

اسد اللہ کو وہیں بریک لگ گئی۔ اس سے اگلا قدم اٹھایا نہ گیا۔ ذہن کے پردے پر قاری گل شیر کی خونخوار صورت اور مدرسے کے بے حس ماحول کے نقوش ابھر آئے۔ دوسرے دن جب وہ اپنے باپ کے ساتھ مدرسے پہنچا، ابھی زیادہ طالب واپس نہ آئے تھے اور قاری گل شیر بھی غائب تھا۔ کمرے میں جاتے ہی وہ بستر میں لیٹ کر رونے لگا۔ ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ آنکھوں میں ابھی تک گھر کے دروازے سے نکلنے کا منظر موجود تھا جب اس کی ماں دونوں بہنوں کو لپٹائے کھڑی تھی اور تینوں کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ دل میں بے چینی اور بے قراری انتہا کی تھی۔ بہتے آنسو بھی

اس کی مدد سے معذور تھے۔ شام تک روتے ہوئے وقت گزرا۔ مدرسے کے باقی کمروں میں بھی طالبوں کی یہی کیفیت تھی۔ پورا ماحول اداسی اور یاسیت سے بھرا ہوا تھا۔ قاری گل شیر حسب معمول عصر کے بعد پہنچا اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ قاری گل شیر کو آج انتہا کا غصہ چڑھا تھا۔ اس نے کسی حافظ کو قرآن ٹیڑھا رکھنے، کسی کا غلاف زمین کو چھوتے دیکھ کر بہت مارا۔ سب حافظ اپنا ایک گھٹنا اوپر اٹھائے مشینی انداز میں جھولتے ہوئے پڑھے جا رہے تھے۔ کسی سے سر تو کیا، آنکھیں بھی اٹھائی نہیں جا رہی تھیں۔

دوسرے دن صبح چار بجے اٹھ کر اسد اللہ نے وضو کیا اور سبق دہرانے لگا۔ آج سبق سنانے والوں میں اس کا نمبر تیسرا تھا۔ دوسرے نمبر پر سبق سناتے ہوئے عزیز الرحمٰن ایک جگہ اٹکا۔ قاری گل شیر کے کرارے تھپڑ نے اسے اُلٹ کر رکھ دیا۔ سبق سنانے کے منتظر اسد اللہ کے جھولنے میں مزید تیزی آگئی۔ عزیز الرحمٰن کے اٹھتے ہی وہ رحل پر قرآن رکھے قاری گل شیر کی ڈیسک کے قریب آ بیٹھا۔ سبق کی جگہ کھول کر اس نے قرآن پاک قاری گل شیر کی ڈیسک پر رکھا اور ڈیسک کی سائیڈ میں خالی رحل رکھ کر سبق سنانے لگا۔ حسب معمول اس نے بغیر غلطی کے سبق سنا کر ختم کیا اور ڈیسک سے قرآن پاک اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ تب بڑھی ہوئی ہتھیلی پر قاری گل شیر نے مہندی کی لالی دیکھ لی۔

''حرامزادے! مہندی لگاتا ہے؟ تجھے پتا نہیں شریعت میں مرد کو ہاتھ پیر پر مہندی لگانا ناجائز ہے؟'' قاری گل شیر نے یہ کہتے ہوئے اسد اللہ کا رکھا ہوا خالی رحل اٹھایا اور اسد اللہ کے کندھے پر وار کیا۔ ''اماں جی!'' کی آواز کے ساتھ چیخ بلند کرتے ہوئے اسد اللہ کو لگا جیسے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ درد کی تاب نہ پا کر وہ اٹھا اور جان بچانے کے لیے دوڑا۔ اسد اللہ کو بھاگتے دیکھ کر قاری گل شیر نے اچھل کر اسد اللہ کے کالر میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ میں اٹھائے ہوئے رحل سے اس کے سر پر زوردار وار کیا۔ رحل کا کونا اسد اللہ کے سر پر پچھلے حصے میں جا لگا اور وہ کھڑے کھڑے گر گیا۔ چٹائی پر اس کے سر کے نیچے خون جمع ہونے لگا۔

''ماما! اس کا خون بہہ رہا ہے،'' قاری گل شیر کا بھانجا زاہد دہشت زدہ ہو کر چلایا۔ تب تک قاری گل شیر اس کے جسم پر دو تین اور وار کر چکا تھا۔

''اٹھ حمید، چھورے کو دیکھ!'' کہتے ہوئے قاری نے رحل پھینکا اور اپنی نشست گاہ پر جا بیٹھا۔ حمید سومرو چٹائی پر پڑے اسداللہ کے پاس آیا اور اسے اٹھاتے ہوئے خوفزدہ ہوگیا۔

"سائیں، یہ مر گیا ہے۔''

''کوئی نہیں مرتا۔ ایسے ہی مکر کر رہا ہے۔ لے جا اسے اور پٹی باندھ دے۔'' حمید نے اسے کندھے سے پکڑا اور اٹھانے لگا۔ اسداللہ کی بے جان گردن جھولنے لگی۔

''نہیں سائیں، یہ مر گیا ہے!'' ڈر کر کہتے ہوئے حمید دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ قاری گل شیر اٹھ کر آیا تو اسداللہ کا بے جان جسم کھلی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھریری دوڑ گئی۔ صدر مدرس مولانا عبدالوحید کو جب تک نیند سے اٹھا کر لایا گیا تب تک اسداللہ کی نعش کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ حافظوں کے کمرے سے رونے کی آوازیں مدرسے کے نیم اندھیرے صحن کو ماتم کدہ بنا رہی تھیں۔ مولانا عبدالوحید کے پہنچتے ہی سب معاملات سنبھال لیے گئے۔ قاری گل شیر اور مولانا عبدالوحید نے سب طالبوں کو ایک بھی حرف کسی کو بتانے کی صورت میں زبان کاٹنے کی دھمکی دے کر کمرے میں بند کر دیا۔ اسداللہ کے والد کو خبر دی گئی کہ اس کا بیٹا وضو کرتے ہوئے گر کر سر میں ٹونٹی لگنے کی وجہ سے شہید ہوگیا ہے۔ منظور احمد جب اسداللہ کی لاش اٹھوا کر گھر پہنچا تو بے ہوش ہونے سے پہلے ماں نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کی مہندی لگی بے جان ہتھیلی زرد ہوگئی تھی۔

❊❊

گمشدہ گلو

گاؤں ڈِگھڑی کی بہت ساری کہانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے، مگر یہ دوسری کہانیوں سے ذرا مختلف ہے۔ اس میں ابھی آپ کہاں ہیں؟ اور اس میں فرق ہے۔ فرق کیا ہے؟ ابھی طے نہیں کیا جاسکتا کہ کہانی فرق واضح کرنے میں کامیاب ہو پائے، یا ممکن ہے نہ کر پائے، لیکن یہ طے ہے کہ اس کا دارومدار کہانی پر ہے۔

گاؤں؛ نام ڈگھڑی، انگریزوں کی کھدائی کردہ نہر کے کنارے اس جگہ آباد تھا، جہاں نہر اور گاؤں کو ریلوے لائن کا پہاڑ سا ٹریک دونوں کو یکجا روک کے اس کا خاتمہ کرتا تھا۔ اس بلند ٹریک کی اس پار ایک ویرانی کی ابتدا ہوتی تھی اور اس ویرانی کی انتہا؟ اس بارے میں ڈگھڑی والے جانتے ہوں گے۔ کوئی زیادہ متفکر نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہر انگریز دور کے متروک منصوبوں میں سے ایک تھی۔ مشہور یہ تھا کہ انگریز عملدار چاولوں کی کاشت والے علاقوں تک آب رسانی کے لیے نہر کھودتے کھودتے جب یہاں پہنچے تو ریلوے لائن کے نیچے پل بنانے کے بجائے نہر کو ادھورا چھوڑ کے چلے گئے۔ تب سے یہ ڈیڑھ دو سو فٹ چوڑائی اور پانچ سے آٹھ ہاتھ گہرائی رکھنے والی نہر، زردی مائل گدلے پانی سے بھری رہتی تھی۔ اگر اس کی لمبائی دیکھیں تو یہ میلوں میل پیچ و خم لیتی چلی جاتی۔ یہ نامکمل نہر اپنے کنارے پر موجود درجنوں گاؤں اور اطراف میں آباد کلر چڑھی زمینوں کا زائد اور مستعمل گدلا پانی اپنے اندر سمیٹتی جاتی تھی، جو کیچڑ بھری کالی نالیاں اس میں انڈیلتی رہتی تھیں۔ اس کی ہیئت اس طرح سمجھی جاسکتی ہے: اگر آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ سیاہی مائل رنگت والی جونک دکھائی دے، جو کلر زدہ زمین کا زہر پی پی کر فربہ ہو چکی ہے۔

ڈگھڑی اس جونک نما نہر کے دائیں کنارے، جنوب کی طرف آباد آخری گاؤں تھا، جو دوسرے

گاؤں سے الگ سا تھا۔ یہ گاؤں نہر کے کنارے کنارے لمبائی میں تھا، اور اس کی حدود نہر کے آخر میں جا کر ریل کی پٹڑی پر دم توڑتی تھیں۔ گاؤں بھر کی چوڑائی تو متروک نہر جتنی ہوگی۔ شرقاً و جنوباً بنے گھروں کے درمیان ایک پندرہ یا بیس فٹ گلی نما راستہ تھا۔ باقی لمبائی پاؤ میل سے کچھ کم۔ اسی لمبائی کی وجہ سے سندھی زبان میں اس کو ''ڈگھڑی'' یعنی تھوڑی سی زیادہ لمبائی والا کہا جاتا تھا، لیکن نام کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جس کی وجہ سے علاقے میں بسنے والا ہر مرد و زن اس کی شناخت رکھتا تھا۔ اگر کوئی اس ''کچھ اور'' کو معلوم کرنا چاہے تو شاید ہی کامیاب ٹھیرے۔ کیونکہ وہ کہنے سننے سے متعلق ہی نہ تھا۔ بس یہ ہر ایک جانتا تھا اور کسی کے بتائے بغیر جان لیتا تھا۔ بس یوں جانیے، اس کا تذکرہ کرنا ایک ایسی دیوار کے پار جانا تھا جہاں ہر کوئی جان بوجھ کے جانے سے احتراز کرتا تھا۔ وہ کسی ضرورت کے سوا تو ڈگھڑی کا نام تک زبان پر لانے سے گریزاں رہتے اور یہ غیر اختیاری ہوتا۔ کبھی کبھار کوئی راہرو ڈگھڑی کا راستہ پوچھتا تو ہاتھ سے اشارہ کر کے راہ دکھا دیتے، اور جب ایسا موقع ہوتا، راہ دکھانے والے حیرت سے مسافر کو ڈگھڑی جاتے دیکھتے رہتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ کیوں؟ انھیں تو کوئی پرندہ بھی ڈگھڑی کی طرف اڑتا بمشکل ہی نظر آتا تھا، تو یہ کیوں؟ اور پھر یہ سوچتے، یا پتا نہیں نہ سوچتے، اس طرف کو جاتے مہمان بھی ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ہاں شاید اُس راہرو کا نلکا یا شاید کنواں میٹھا پانی چھوڑ گیا ہوگا۔ اور یہ بات کہیں رہ تو نہیں گئی کہ ڈگھڑی کے رہنے والوں میں سے اکثر نلکے لگانے اور کنویں کھودنے کا کام کیا کرتے تھے؟ بس یہی ہوا ہوگا کہ ناگاہ وقت میں نلکا پانی چھوڑ جائے تو بندے بشر کو مجبوری پڑ ہی جاتی ہے۔ نہیں تو باقی وقت ریل کی پٹڑی کے ساتھ ڈگھڑی کو جاتا ڈھائی میل کا پتلا، تیلی سی جسامت والا راستہ سارا سارا دن خالی ہوتا، سوائے اس وقت کے جب سویرے صبح نلکے لگانے کے کاریگر اور ان کے ہم قصبہ مددگار گاؤں چھوڑ کے روزی روٹی ڈھونڈنے شہر جاتے۔ قصبوں آبادیوں سے دور، اس راستے پر چلتے ہوئے ڈگھڑی کے باسیوں کا انداز دوسرے لوگوں سے الگ نظر آتا تھا۔ قطاریں خاموشی سے سر جھکائے چلتے جانا۔ یوں جیسے چیونٹے آپس میں جڑے چلے جا رہے ہوں۔ ایک اور تفاوت صبح و شام میں تھا۔ شام میں جب واپس ڈگھڑی جاتے نظر آتے تو دیکھنے والا محسوس کرتا، ان کے بازو ان کے بدن سے الگ پیچھے پیچھے لڑھکتے جا رہے ہوں۔ شہر میں یہ تانگا اسٹینڈ کے برابر بنے اس چھپر کے نیچے دکھتے جس میں گھوڑوں کے پانی کی بڑی ناند رکھی ہوئی تھی۔ کیا کاریگر، کیا مددگار، اپنے اپنے اوزار رکھے

اکڑوں بیٹھا تنکے سے سامنے زمین کو کریدتا رہتا، اور یہ کام ایسی محویت سے ہوتا جیسے ان پر مقدس ذمے داری ڈال دی گئی ہو۔ جب کبھی کوئی نلکے یا کنویں کا کام کروانے آیا ہوا چھپر کے آگے کھڑا ہو کر آواز دیتا تو ان میں سے کوئی ایک چپکے سے اوزار سنبھالتا، اس کے پیچھے چل نکلتا۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ آنے والے کی آواز بھی سمجھنا ضروری ہوتا تھا کہ نہیں۔ جب ان میں سے کوئی اٹھ کر چلا جاتا تو باقی اسی شغل میں مصروف رہتے۔ سر اٹھا کر دیکھنے کا تکلف تک نہ کیا جاتا۔

یہ کہانی جو ڈگھڑی کی دوسری کہانیوں سے زرا مختلف ہے، اس کی ابتدا منگلوار کی اس صبح کاذب سے ہوتی ہے جب سردی کا راج ختم ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور متروک نہر کے سبزی مائل گدلے پانی، قصبے کی ویران گلی، مٹی کے بنے کوٹھوں، جھاڑ کانٹوں سے بنی چار دیواریوں پر دھند کا ڈیرہ تھا۔ اس وقت گاؤں کے مغربی گھروں کے آخری کچے کوٹھے کے اندر جلتی لالٹین کی روشنی میں گلو کی ماں بچہ جن کر مر گئی۔ ڈگھڑی کی دائی صاحباں مائی نے ناڑ کاٹا، گلو کی ماں کی آنکھیں بند کیں، اور اس کے سر اور جبڑے کو پٹی باندھنے کے بعد بچہ اٹھا کر کوٹھے سے باہر اکڑوں بیٹھے گلو کے باپ کو تھمایا اور لاش کو نہلانے دھلانے، پلٹ کر کوٹھے میں چلی گئی۔ جب سورج کی کرنیں دھند کو مات دے کر زمین پر اتریں تو اس وقت تک لاش قبر میں ڈالے جانے کے لیے تیار تھی۔ ڈگھڑی کے باسی لاش اٹھا کر قبرستان کی اور چلنے لگے۔ عین اس وقت ریلوے لائن سے ایک ریل گاڑی دھڑدھڑاتی گزری۔ متروک نہر کے کنارے کی مٹی کے ساتھ کچے کوٹھے بھی لرزش میں آنے لگے۔ ویسے تو گاؤں بھر اس ریل گاڑی کی وجہ ہی سے حرکت پاتا تھا، مگر آج گاؤں کے لوگ لاش اٹھائے حرکت میں تھے۔ اس لیے ریل گاڑی کی آمد کا وقت جان ہی نہیں پائے تھے اور روز کے معمول کے مطابق گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے کے بجائے، لاش اٹھائے راستے کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ آج سب کے سر جھکے ہونے کے بجائے سیدھ میں سامنے کے قبرستان کو جاتے راستے کی سمت اٹھے ہوئے تھے۔ پندرہ سالہ گلو کو جنازے کے ہمراہ چلتے یہ سوچ آئی: تین دن چاول پکیں گے اور لوگ ان کے کچے کوٹھے کے باہر صحن میں بیری کے درخت کے نیچے چٹائیوں پر بیٹھے رہیں گے۔ گلو کے چہرے کے عضلات زرا سے پھیلے اور لمحے کے لمحے میں پھر سکڑ گئے۔ اس نے اپنی سوچ کو جھٹک کے قبرستان کی اور نظریں جمالیں۔ سوچ نے پھر نقب لگائی۔ گاؤں میں موت کے سوا کسی چیز کا علم کب ہوتا ہے۔ شادی کا تب معلوم پڑتا ہے جب کسی کو بچہ

پیدا ہو جائے؛ پھر پتا چلتا ہے، پچھلے رجب میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ اب کی بار اس نے نچلے لب کو کاٹا۔ اتنے زور سے کہ دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اس نے پھر نظریں قبرستان کی سمت گاڑ دیں۔ اب قبروں کے سوا کوئی خیال قریب نہ آیا۔ ماں کو دفنانے کے دسویں روز جب گلو نے دو پہر کی روٹی کھانے کے لیے اپنے کچے کوٹھے میں قدم رکھا تو صاحباں مائی اسے اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ بچہ، زچہ کے مرنے کے دن سے اب تک، اسی کی گود میں تھا۔ گلو کی آمد محسوس کر کے کچے کوٹھے کا سکوت اور بڑھ گیا۔ گلو نے کونے میں رکھی ہوئی رکابی سے روٹی اٹھائی اور جھاؤں کی پتلی لکڑیوں سے بنی ٹوکری میں سے ایک پیاز اٹھا کر زمین پر رکھا، اس کی اوپری سطح کو مکا مار کر کھولا اور اس کی پرتوں میں نمک مرچ ڈال کر چپڑ چپڑ کھانا کھانا شروع کر دیا۔ کھانا ختم کر کے وہ بوری کی بنی چٹائی پہ سر کے نیچے باز و دے کر، صاحباں مائی اور اپنے باپ کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صاحباں مائی اور اس کے باپ کے لب ہلے جاتے تھے۔ چند ساعتوں میں اس نے دیکھا، اس کا باپ اچک کر کھڑا ہو گیا۔ باپ کی اس پھرتی سے گلو نا آشنا تھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کچھ دیر میں صاحباں مائی اس کے اکڑوں بیٹھے باپ کے سر پر اپنی کمر پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی نظر آئی۔ گلو کے خیال نے کوئی راستہ نہ پایا۔

دو دن بعد رات کے دوسرے پہر کی تاریکی میں گلو نے اپنی منگ کو اپنے گھر میں سرخ جوڑا پہنے دیکھا۔ وہ جلتی لالٹین کی روشنی میں صاحباں مائی، اس کے باپ، اس کے منگ کے باپ اور ماں کے ساتھ کچے کوٹھے میں اندر جا رہی تھی۔ گلو نلکا چلاتا، اوک میں پانی پیتا، اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں اس نے صاحباں مائی کو اپنی منگ کے ماں باپ کے ساتھ گھر سے باہر جاتے دیکھا۔ گلو کی سوچ نے راہ پا لی۔ اچھا ہوا انھوں نے اسے نہیں دیکھا ورنہ منگ کا باپ ضرور برا سا منھ بناتا۔ پر میں تو سامنے کھڑا تھا، لالٹین کی روشنی میں۔ اس نے کیسے نہ دیکھا ہو گا؟ نہیں۔ نہیں دیکھا ہو گا، ورنہ صاحباں مائی اس کے سر پر ہمیشہ کی طرح ہاتھ نہ گھماتی۔ گلو کی سوچ کہیں فرار ہو گئی۔ مطمئن ہو کر وہ کچے کوٹھے میں سونے چلا، مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ گلو اس رات بیری کے نیچے پڑی چٹائی پر سو گیا، اور بھلا کون سی زیادہ سردی تھی جو نیند نہ آئے۔

اگلی صبح گلو نے اپنی منگ کو دیکھا، وہ کھڑی ہو کر جھاڑو کرتے وقت ذرا لڑکھڑا رہی تھی۔ جھاڑو کے بعد روٹی پکا کر اس نے گلو کے باپ کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ بچہ اس کے قریب لیٹا تھا جسے بڑے

بڑے نوالے اٹھاتے وہ دوسرے ہاتھ سے تھپک رہی تھی۔ کھانا کھا کر گلو کی منگ نے بچے کو اندر کوٹھے میں سلایا اور گلو کی روٹی لے آئی۔ پر بیری کے نیچے گلو تو تھا ہی نہیں۔ دوسری دوپہر گلو کا باپ گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا، گلو کو ڈھونڈنے کی غرض سے نکلا۔ تب ڈگھڑی کے اکلوتے چرواہے ذاکو غریبڑے نے اس کو بتا دیا کہ گونگا گلو، دُپہر سے کچھ پہلے قبرستان کے راستے پر تھا۔ یہ سن کر گلو کے باپ کے چہرے کے عضلات ذرا سے پھیلے اور پھر اپنے آپ سکڑ گئے۔

❁❁

پانچ من گلاب کے پھول

بارہ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس کا جسم چارپائی پر بے دم پڑا تھا۔ سر داہنی جانب ڈھلکا اور بازو اوپری طرف اسی جگہ، جہاں انھیں اسے اٹھا کر رکھنے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ محمد زمان اس کے اوپر کھڑا شکنوں سے بھری پیشانی لیے کچھ پڑھتا، پھونکتا جا رہا تھا۔ زمان کی بیوی، جس کا داہنا ہاتھ سینے اور گلے کے درمیانی حصے پر جما تھا، تیز تیز سانسیں لیے جا رہی تھی۔ دھونکنی کی طرح پھولتا پچکتا اس کا سینہ بھاپ نکالتی بھٹی کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ زمان کی بیوہ بہن چارپائی کی پائینتی پر بازو ٹکائے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اور زمان کی باقی دو بیٹیاں چارپائی سے دور، اور اکلوتا بیٹا کمرے میں بند کھڑکی سے آنکھ لگائے خوفزدہ حالت میں دیکھے جا رہا تھا۔ چھت میں لٹکے سفید پنکھے کے سیاہ کناروں والے پر آہستگی سے گھومتے چرّخ چوں کی آوازیں نکال رہے تھے۔ پنکھے کی آواز، زمان کی بیوی کی تیز سانسوں، زمان کے مونچھوں میں چھپے لبوں سے نہ سمجھ آنے والی آواز کے باوجود ماحول میں خامشی کا تاثر تھا۔ ابھی ابھی وہ اسے چارپائی پر لٹانے میں کامیاب ہو پائے تھے۔ صبح اٹھتے وقت تو وہ چنگی بھلی تھی، پھر اپنے آپ سے نکل گئی۔ چارپائی پر پاپے چائے میں ڈبوتے اٹھی اور چارپائی الٹ دی۔ اس کے ساتھ بیٹھی چائے سڑکتی چھوٹی صفیہ زمین پر چارپائی کے بان کے نیچے کُرلاتی رہ گئی۔ بھلا اس وقت صفیہ پر دھیان کیسے جاتا؟ امیراں برآمدے میں کھڑی غرائے جا رہی تھی، جیسے حلق سے اگلا نہ جا رہا ہو۔ ماں جب تک آئی، وہ بھینس کے ڈکرانے سی آواز کرتی زمین پر جا پڑی۔ عامل محمد زمان بیوی کی آوازوں پر نیم کا مسواک درمیان میں چھوڑتا وہاں پہنچا۔ لوٹتی پوٹتی امیراں کی خرخراہٹ اور بڑے بڑے دیدوں سے اسے اندازہ ہوا کہ وار ہو گیا۔ اس کی دل پر ایک ضرب لگی۔ اس کے تو شب و روز اسی وار ہو جانے کی فکرمندی میں نکلتے تھے، مگر دھیان اکلوتے بیٹے خلیل کی طرف رہتا تھا۔ اِدھر اپنے علاقے میں آسیب نکالتے، جادو کا توڑ

کرتے، جن اور غیبات کے تعویذ لکھتے عامل محمد زمان کو یہ پریشانی گھیرے رکھتی تھی کہ جوابی وار آج ہو کہ کل، کیونکہ منہ پر صاف دھمکیاں سنائی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے محمد خلیل کا گلا حفاظتی تعویذات کے گھیرے میں رہتا تھا، لیکن یہ تو انھوں نے اگلی دکھا کر پچھلی ماری تھی۔ امیراں پر غیبات کے حملے کا محمد زمان کو کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس نے لوٹتی پوٹتی امیراں کی کان کی کچیا پکڑ کر دعاے ابودجانہ پڑھنا شروع کی۔ محمد زمان کا ہاتھ کیا لگا، امیراں پھڑک اٹھی۔ اس کا جسم ایڑیاں پٹخنے لگا۔ چٹ ان پڑھ ہونے کے باوجود زمان کی بیوی ان معاملات کی خبر رکھتی تھی۔ اس نے خلیل کو کمرے اندر دھکیل کر کنڈی لگائی اور ایک فاصلے پر کھڑی ہوگئی۔ عامل محمد زمان دعاے ابودجانہ پڑھنے پر قادر ہی نہ ہو پا رہا تھا۔ امیراں کے کان کی کچیا پکڑنا لازم تھا اور محمد زمان کو مشکل تھی کہ کہیں بالی کچیا کو چھیل نہ ڈالے۔ ایسے خطرناک مواقع پر کچیا کی قربانی تو کوئی بات نہ تھی مگر آج عامل محمد زمان کے ہاتھ گرہ لگے تھے۔ جب خطرہ سرحد پر منڈلانے لگا تب اس نے بیوی اور بہن کو ''جو بھی یاد ہو'' پڑھنے کا کہہ کر امیراں کے ہاتھ پاؤں پکڑنے کا بولا۔ سہمی ہوئی دونوں عورتیں آگے آئیں۔ زمان کی بہن کو تو چار قل یاد تھے۔ اس نے زور زور سے وہ پڑھنا شروع کیے اور بیوی ایک سر سے ''بسم اللہ، بسم اللہ'' کیے جا رہی تھی۔ محمد زمان کی بہن نے امیراں کے ہاتھ پکڑے اور بیوی ٹانگیں جکڑنے کا زور لگانے لگی۔ اب جا کر محمد زمان دعاے ابودجانہ شروع کر سکا۔ تب، جب ایک ہاتھ سے کان کی کچیا اور دوسرے سے امیراں کی ناک بند کرتے محمد زمان نے دوسری بار دعاے ابودجانہ پوری کی، امیراں قابو میں آچکی تھی۔ محمد زمان نے چار کیل دم کر کے چارپائی کے پایوں میں گاڑے اور امیراں کو اس پر رکھنے کا کہا۔ بیوی اور بہن نے اٹھا کر اسے بان پر ڈال دیا۔ محمد زمان کے ذہن پر فکرات اپنا لبادہ لپیٹنے لگے۔ اس کے ساتھ خیالات میں یہ دستک بھی ہو رہی تھی کہ پریل حاجانو باہر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی ڈاچی اور بیوی، دونوں پر غیبات نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ ڈاچی تیسری بار بھی لگ نہیں اٹھا پائی تھی اور بیوی تھی کہ اسے دوروں پر دورے پڑ رہے تھے۔ محمد زمان نے عارضی بندوبست پر راضی کر کے پریل حاجانو کو ڈاچی کے لیے تعویذ اور بیوی کے لیے سات گرہیں لگا کالا ریشمی دھاگہ دم کر کے روانہ کیا اور پھر امیراں کے لیے تدبیر کرنے لگا۔ گھر کے چاروں کونوں میں آذان بول کر، امیراں کے رہنے والے کمرے کی چھت کے قریب دیواروں میں چار کیل گاڑ کر، آخری تدبیر کے طور پر نقش سلیمانی لکھ کر محمد زمان جب فارغ ہوا، تب تک امیراں کے ہوش میں

آنے کے اثرات نمودار ہو رہے تھے۔ اسی روز امیراں کو تہہ کیا ہوا تعویذ چمڑے میں بند کروا کر پہنا دیا گیا۔ اب سورج سنکھ سے چڑھنے اترنے لگا۔ ایسی کوئی بد اثری ظاہر نہ ہوئی جو تشویش کو ناک تک لا کر چھوڑتی۔ البتہ ماں کو فکر اٹھتی کہ جوان بیٹی پر اثر چڑھ آنا۔ ابھی تو رب سائیں نے خیر کر دی مگر کل کلاں اگر پھر کچھ ہوتا ہے تو کون اسے دلہن بنا کر گھر لے جائے گا؟

ماہِ صفر کیا آیا، ماں کی طرف خواہ مخواہ کے وسوسے رخ کرنے لگے۔ بلا وجہ ہول اٹھتے رہتے۔ وہ بار بار امیراں سے پوچھنے لگتی کہ اسے کچھ محسوس تو نہیں ہو رہا؟ ٹھیک تو ہے ناں؟ چودھویں کا چاند چڑھتے ہی فکرات حقیقت میں بدلیں اور عامل محمد زمان کی سب تدبیریں ہوا ہو گئیں۔ امیراں پھر اثر میں آ گئی۔ حیوانی آواز نکالتی وہ اِدھر سے اُدھر ٹکریں مارتی رہی۔ اس رات قابو کیے جانے اور پڑھائی کرنے کے باوجود وہ بار بار چھڑا کر قفل زدہ دروازے کو دوڑتی اور کمرے سے باہر نکلنے کا زور لگاتی۔ زمان کے ساتھ آج اس کی بیوی اور بہن کے ساتھ خلیل بھی مدد میں تھا مگر وہ ایک ہاتھ نہ آ رہی تھی۔ سورہ جن سے لے کر دعائے عقد الجن پڑھ پڑھ کر پھونکنے، کان اور ناک کو بند کرنے، کان میں آذان بولنے کے بعد بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ عامل محمد زمان کی بے بسی ناقابل بیان تھی۔ اس کو کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے دو پہر بیتنے کے وقت کہیں جا کر امیراں بے سدھ ہو کر پڑ گئی۔ گھر والے طوفان کے بعد والے سکون میں آئے مگر محمد زمان منجدھار سے کیسے نکلے؟ بیچ صحن میں بغیر رلی چارپائی پر لیٹے اس کے ہاتھ کی انگلیاں خشخشی داڑھی میں خلال کیے جا رہی تھیں۔ پیشانی پر لکیروں کی تعداد سے اضطرابی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ ساری پیشانی جیسے کھیت کی ٹیڑھی میڑھی نالیوں کی صورت نظر آ رہی تھی۔ صحن میں مٹی کا فرش، کچی اینٹوں سے بنی قدِ آدم دیواریں اور برآمدے کا کچھ حصہ چاندنی میں چٹکا ہوا تھا۔ کونے میں لگے شرینہہ کے چمکتے پتے ساکت تھے۔ محمد زمان کے پاس پہلو بدلائے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وقت آخری پہر کے پاس تھا کہ صحن میں لیٹے محمد زمان کی دو گھڑی پہلے لگی آنکھ کھل گئی۔ شرینہہ میں سے بلی کے خوخیانے کی آواز نکلی آ رہی تھی۔ محمد زمان کچی نیند سے بیدار ہوا تو اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس نے دیکھا کہ امیراں قدم قدم چلتی کمرے سے برآمدے اور برآمدے سے صحن کو آ رہی ہے۔ ننگے سر، ننگے پاؤں۔ وہ چلتی چلتی شرینہہ کے نیچے آ رکی۔ شرینہہ سے اب کے خوخیانے کی آواز کیا ابھری، امیراں کے حلق سے غرّاہٹ کی گونجدار آواز سنائی دی۔ اس آواز نے محمد زمان کو ہلا کر

رکھ دیا۔ اس کے سر اور گدی میں سوئیاں چبھنے لگیں اور ہاتھ پاؤں میں کپکپاہٹ دوڑ پڑی۔ فضا خوخیاہٹ اور غراہٹ سے لبریز تھی اور محمد زمان اٹھ کھڑے ہونے پر قادر نہ تھا۔ اس کے حواس تب جاگے جب" آذان کہہ آذان" کہتے بہن نے محمد زمان کو آ جھنجھوڑا۔ محمد زمان نے اٹھ کھڑے ہونے کا زور لگایا اور کانوں پر ہاتھ جمائے آذان بولنے لگا۔ شروع میں آواز پھسپھساتی نکلی اور پھر لفظ لفظ کرکے بلند ہوتی گئی۔ آذان کی آواز نے شرینھ میں خامشی کا راج قائم کر دیا۔ خامشی کیا ہوئی، امیراں شرینھ کے اور نزدیک گئی اور اس کے تنے پر ہاتھ جمائے زور لگانے لگی، جیسے درخت جڑوں سمیت اسے نامنظور ہو۔ اس کے منھ سے غراہٹ اسی رفتار سے نکلی آ رہی تھی۔ ایسا ہیبت ناک ماحول پیش تھا جس کے سامنے جانے کی شاید ہی کسی میں ہمت ہو۔ محمد زمان، اس کی بیوی اور بہن صحن میں بتوں کی طرح کھڑے تھے۔ انھوں نے ہلنے جلنے کی قدرت تب پائی جب امیراں تنے سے الگ ہوتی واپس کمرے میں چارپائی پر جادراز ہوگئی۔ محمد زمان لاتعلقی اور بےخبری میں اپنے کمرے کو چلتا گیا۔ اپنی بیوی کی سسکیاں تک اس کی سماعت تک نہیں پہنچیں۔ بےسہارگی نے اس کا قد گھٹا دیا تھا۔ سہارے کی تلاش میں وضو کر کے عمل کی ابتدا کی مگر زبان بار بار چوکی جا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں جو اس کی ڈاڑھی سے کھیلنے کی عادی تھیں، آج چپ سادھے تھیں۔ ان سے سانس لینا بھولا ہوا تھا۔ صبح ہوئی، اور یہ ایک عام روزمرہ والی صبح نہ تھی۔ کچھ بھی معمول کا نہ تھا۔ محمد زماں کی بیوی بچوں کے کمرے میں لیٹی رہی۔ بچے اپنے اپنے بستروں میں بغیر کروٹ بدلے دبکے رہے۔ محمد زماں نے اٹھ کر نہ باآواز بلند "غرر غرر" کرتے غرارے کیے نہ نیم کا مسواک کیا۔ حالانکہ روز اس کے غراروں سے بچوں کے کان کھڑکھراتے اور شرینھ میں بسیرا کیے بیٹھی فاختہ اپنے بچے گھونسلے میں چھوڑے غراروں کی آواز سے اڑ جاتی تھی۔ جب امیراں نے اٹھ کر ماں سے چائے مانگی تب محمد زماں کی بیوی نے جان آتی محسوس کی۔ بیوی چائے بنانے جاتے وقت محمد زماں کو امیراں کے بارے آگاہی دیتی گئی۔ محمد زماں حوائجات ضروری سے فراغت پاکر چائے پینے صحن میں بیٹھا تو امیراں اس کے سامنے چارپائی پر آ بیٹھی۔

"بابا، میر گضب خان آپ کو سلام کہتا ہے!" یہ سن کر پریشانی سے نبڑتے محمد زماں نے امیراں کو دیکھا۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے گھیرے میں تھا۔ تاثرات میں نرمی کے باوجود آنکھوں میں ایک ایسا احساس تھا جو بغور دیکھنے سے روکتا تھا۔

''بیٹی، کیسی ہو تم؟''

''بابا، میر گضب خان کہتا ہے، اس کی آپ سے دشمنی نہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی، ٹھیک ہے۔ تم نے چائے وائے پی لی؟''

''بابا، میر گضب کوکاف (کوہ قاف) کا ایک بڑا جن ہے۔ اس کی دشمنی ہو گئی ہے، وہ یہاں کچھ دن رہنے آیا ہے۔'' محمد زماں کا سر جھکا رہا۔ جواب میں کچھ نہ بولا۔ ''وہ دشمن سے جنگ میں زخمی ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہو کر چلا جائے گا۔'' محمد زماں اب بھی چپ تھا۔ ''اگر تم نے سائیں مست علی شاہ کو بتایا یا دھونی دی تو میں کھلیل کو نہ چھوڑوں گا۔'' امیراں کی آواز اور لہجہ بدلتا گیا۔ بھاری اور بلند۔ جیسے لوہے کے ڈرم سے نکل رہی تھی۔

''نہیں غضب خان، نہیں! میں کچھ بھی نہ کروں گا،'' عامل محمد زماں سراسیمگی سے بولا۔

''قسم اٹھا دستگیر کی، کہ تو کچھ بھی نہ کرے گا۔''

''دستگیر کی قسم، میں کچھ نہیں کروں گا۔''

''سائیں مست علی شاہ کو نہیں بتائے گا۔''

''میں سائیں مست شاہ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''کوئی عمل نہیں کرے گا اور دھونی وونی نہیں دے گا۔ اٹھا قسم۔''

''دستگیر پیر کی قسم، میں کوئی عمل تعویذ نہیں کروں گا۔ لیکن تو بتا، تو کب امیراں کو چھوڑے گا؟''

''میں جلد امیراں کو چھوڑ دوں گا۔''

''کب؟''

''میں چلہ کرنے آیا ہوں۔ وہ پورا کروں گا اور چلا جاؤں گا۔''

''تم حضرت سلیمان کی قسم اٹھاؤ، تم چالیس دن بعد امیراں کو چھوڑ دو گے۔''

''میں حضرت سلیمان کی قسم اٹھاتا ہوں کہ میں اپنا چلہ پورا کر کے چلا جاؤں گا۔ لیکن اگر تم نے کچھ کیا تو پھر میرا وعدہ بھی ختم!'' امیراں چارپائی سے اٹھ کر چلی اور پیچھے محمد زماں ہتھیلی پر پیشانی ٹکا کر ڈھے گیا۔

''سائیں، اب کیا ہوگا؟'' زماں کی بیوی کے منہ سے الفاظ ٹپک پڑے۔

''اس نے حضرت سلیمان کی قسم اٹھائی ہے، اگر نہیں گیا تو خود جل کر بھسم ہو جائے گا۔'' محمد زماں قسم کے بعد ذرا اطمینان میں تھا مگر بیوی کو محمد زمان کے کچھ نہ کرنے والی بات کیل کی طرح سینے میں جا ٹھکی۔ اس کے پاس محمد زمان کا جن غیبات کے سامنے یہ رویہ نا قابلِ قبول تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، محمد زمان اپنے عمل سے جن کو جلا کیوں نہیں رہا؟ زبان کھولنا عورت کی سرشت نہ تھا اس لیے وہ چارپائی پر بیٹھ کر امنڈتے آنسوؤں کو روکنے لگی۔

اس واقعے کا تیسرا روز تھا کہ محمد زماں گھر کے لیے گوشت لایا تھا۔ جمعے کے جمعے گھر میں گوشت پکتا تھا۔ زماں کی بیوی گوشت تھال میں رکھے بوٹیاں بنا رہی تھی کہ امیراں اس کے اوپر آ کھڑی ہوئی۔ ماں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ کلف زدہ لٹھے کی طرح سیدھے بازو لٹکائے نظر آئی۔ ماں کی نگاہ نیچی نہ ہوئی تھی کہ امیراں جھکی اور اس نے تھال مع گوشت اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ماں بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ سے امیراں کی چٹیا پکڑ کر دوسرا ہاتھ طمانچے کے لیے سیدھا کیا کہ امیراں کی اجنبی آنکھوں نے دل میں بیٹھے وسوسوں کو جگا ڈالا۔ اس کے ناخنوں میں سے غصے سے بھری توانائی نکل گئی۔

''گوشت کیوں پھینکا؟'' زماں کی بیوی کے منھ سے الفاظ خادموں کی طرح سمٹ کر باہر آئے۔

''میر گغضب خان مچھی کھائے گا۔'' یہ ابتدا تھی۔ اب کسی دن میر غضب خان مچھلی تلنے کو بولتا اور اکیلا ہی کھا جاتا۔ باقی گھر والے دال پر گزارہ کرتے۔ کسی وقت تکے کے لیے مزاج کرتا تو کبھی قیمے بھرے پراٹھے کا حکم ہوتا۔ ہر کھانے کے ساتھ پیپسی یا پاکولا لازم تھی۔ اور میٹھا بھی میر غضب خان کی فرمائش ہوتی۔ کبھی زردہ پک رہا ہوتا تو کبھی سوجی والا حلوہ۔ کبھی بزار سے گلاب جامن منگوائے جاتے تو کبھی منصور ماوے والے کے پاس سے ماوا۔ دسویں دن نیا جوڑا سلوایا جانے لگا۔ چلّے کے اختتام سے دو دن پہلے امیراں عامل محمد زماں کے پاس آ بیٹھی۔

''میں ابھی ایک چلّہ اور پڑھوں گا۔'' امیراں کی آواز بھاری تھی۔

''لیکن تم نے وعدہ کیا تھا، قسم اٹھایا تھا حضرت سلیمان کا۔''

''مجھے چالیس دن اور چاہییں۔ اس سے ایک دن بھی بڑھا تو مجھے سائیں مست علی شاہ کے پاس لے جا کر جلا کر کھاک کر دینا۔ تم خود دیکھ رہے ہو کہ میں نے تمھاری بیٹی کو کوئی نکسان نہیں دیا۔ میرا

دشمن بہت طاقت والا ہے۔ مجھے اور مہلت چاہیے۔'' عامل محمد زماں نے قبول کرلیا مگر محمد زماں کی بیوی کے صبر کا پیالہ بھر چکا تھا۔

''سائیں، یہ پھر چالیس دن ٹل گیا۔آپ کچھ کرتے کیوں نہیں؟''

''کیا کروں؟'' محمد زماں اس کی بات پر جھنجھلا کر غصے سے ابل پڑا۔

''سائیں، اس کو نکالیں، یہ میری بیٹی کو مار دے گا۔'' محمد زماں کی بیوی سسک پڑی۔

''جاہل عورت، اس کو میں ابھی کے ابھی جلا کر خاک کرسکتا ہوں مگر امیراں کی جان بھی جاسکتی ہے۔''

''تو پھر سائیں مست علی شاہ کے پاس کیوں نہیں لے جاتے؟''

''سائیں مست علی شاہ کے پاس لے جاؤں تو سہی، مگر یہ اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ میں نے اپنے معمولوں کے ذریعے پتا کروایا ہے کہ اگر سائیں اس کو جلا ڈالیں گے تو آگے اس کے قبیلے والے خلیل کو نہیں چھوڑیں گے۔ یہ غضب خان چالیس دن کا چلہ پورا کر کے چلا جائے گا، اس نے قسم دی ہوئی ہے۔ یہ صرف یہاں چھپنے آیا ہے۔ اس کو میری وجہ سے ہمارے گھر میں کوئی دشمن ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔'' یہ باتیں کہہ کر محمد زماں اٹھ کر چلا گیا۔ معلوم نہیں کیوں، میر غضب خان کے سامنے خود کو بے بس پاتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، پھر چالیس دنوں کی گنتی میں مشغول ہو گیا اور میر غضب خان کی فرمائشیں اور معمولات اسی طرز پر جاری رہے۔ عامل محمد زماں کی پریشانی اور قرض روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ جائے پناہ کوئی نہ تھی، بجز اس کے کہ میر غضب خان کی اٹھائی ہوئی قسم نے عصائے سلیمان علیہ السلام کی طرح سہارا دے رکھا تھا۔ دوسرا چالیسواں سرک سرک کر قریب ہوتا جا رہا تھا۔ عامل محمد زماں کی کیفیت ایسی تھی کہ ان دنوں اس کی انگلیاں اپنا روز کا ورد ہفت ہیکل اور مسبحات عشر پڑھنے سے زیادہ غضب خان کے چلے کے بقیہ دن گننے کے کام آتی تھیں۔ آخری دنوں کے آس پاس میر غضب خان کا پیغام آیا، اور اس دفعہ براہ راست بات کے بجائے محمد زماں کی بیوی کو وسیلہ بنایا گیا تھا۔ امیراں نے ماں کو بتایا تھا کہ میر غضب خان اپنا چلہ مکمل کرنے والا ہے اور وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔ اب جاتے جاتے وہ اس خاندان کو کچھ دے کر جانا چاہتا ہے۔ خزانے کی ایک دبی دیگ کا میر غضب خان کو علم ہوا ہے اور اس نے اس دیگ کے محافظ جنوں کو مطیع کرلیا ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ دیگ محمد زماں کے حوالے ہو۔ یہ بات

عامل محمد زماں کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ خزانے سے بھری دیگ ابتدا سے اس کی منزل تھی۔ ایک عرصے سے وہ اس خیال میں تھا، مگر یہ کام بہت بڑا اور خطرناک تھا۔ سائیں مست علی شاہ تک اس سے گریز رکھتے تھے۔ اس میں جان جانے کا مکمل احتمال ہوتا ہے مگر میر غضب خان خود اس دفینے کو اس کے حوالے کرے تو اور کیا چاہیے۔ ورنہ تو اسے پتا تھا کہ سائیں مست علی شاہ کے ایک خلیفے سکندر علی کھتری نے دفینہ نکالنے کی کوشش کی تھی۔ سائیں نے اسے بہت روکا تھا مگر اس نے ہزار حجت کر کے علم اور طریقہ سیکھا تھا۔ سکندر کھتری کے خاندان میں یہ بات چلی آ رہی تھی کہ ان کے گھر میں دیگ ہے۔ زمین دوز دیگ ان کے گھر میں اِدھر سے اُدھر چلتی تھی اور اس کے کھڑکنے کی وہ لوگ کبھی کبھی آواز سن لیتے تھے۔ سکندر نے سائیں مست علی شاہ کے بتائے طریقے پر ایک سفید دیسی اور اصیل مرغے کو چالیس دن تک باندھ کر اسے پاک خوراک دی تھی اور اسے گند کھانے کی عادت سے بچایا تھا۔ اکتالیسویں دن اس نے مرغے کے گلے میں دفینے کا تعویذ سرخ کپڑے میں باندھ کر گھر کے صحن میں جا چھوڑا۔ مرغا اِدھر سے اُدھر چلتا باورچی خانے کو آیا اور چولھے کے قریب اپنی چونچ زمین پر مارنے لگا۔ یہ علامت تھی، دیگ باورچی خانے میں دفن ہے۔ سکندر کھتری نے اس کے بعد تین ماہ تک چودھویں کی رات گوبروں کی آٹھ ڈھیریاں سلگا کر ان کے بیچ بیٹھ عمل مکمل کیا تھا۔ اس دوران خوفناک مورتیں اس کے سامنے آ کر اسے دہلاتی رہیں مگر سکندر ثابت قدم رہا۔ اسے رینگتے سانپ اور مردہ باپ کی شکل دکھائی دی تھی مگر عمل سکھاتے وقت اسے سائیں نے بتایا ہوا تھا کہ یہ سب دھوکے اور مکر سے اس کا عمل برباد کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس نے بہرصورت اپنا عمل مکمل کر کے ہی اٹھنا ہے۔ عمل کے آخری پل صبحِ کاذب سے تھوڑا پہلے سامنے سائیں مست علی شاہ کی شکل سامنے آ کھڑی ہوئی کہ اٹھ جا، اب تیرا کام پورا ہو گیا ہے۔ سکندر سائیں کی خوش خبری پر دائرے سے باہر نکل آیا۔ سائیں اسے مبارکیں دیتے خود درگاہ تک ساتھ لے گئے اور پھر اسے رکنے کا کہہ کر غائب ہو گئے۔ وہ تو بعد میں کھلا کہ غیبات کی چال تھی۔ اس کے بعد سکندر کھتری کا دماغ چل گیا تھا اور عجیب عجیب باتیں کہتا تھا۔ ایک مرتبہ تو سائیں کے خلاف سننے پر کچھ عقیدت مندوں نے اس کی ٹھکائی بھی کی تھی مگر دفینہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ سیدھے پن میں نہ آ سکا تھا۔ سکندر کھتری والا واقعہ اچھا خاصا مشہور تھا اس لیے محمد زماں شوق کے باوجود دفینے کا عمل سیکھنے اور کرنے کی ہمت پکڑ نہ سکا تھا، حالانکہ کئی بار وہ اپنے دوستوں سے یا

گھر میں بات کرتا رہتا تھا۔ اب چونکہ میر غضب خان مہربان ہوا تھا اور اس نے دفینے کے محافظوں کو بھی مطیع کر لیا تھا تو بات صرف یہ رہ گئی تھی کہ کھدائی کر کے دفینہ نکال لینا تھا۔

یہ دوسرے چلے کی آخری رات کی بات ہے۔ اس دن میر غضب خان نے زردہ بنوایا اور پہلی بار گھر والوں کو اس میں شریک کیا۔ عشا کے بعد شہر کی گلی بازار میں چلتے پھرتے لوگ جب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے اور سناٹا چھانے لگا، تب محمد زماں والے کمرے میں محمد زماں، اس کی بیوی اور بہن ایک چارپائی پر ساتھ بیٹھے۔ دوسری چارپائی پر امیراں اجرک کے نقش و نگار والی بچھی چادر پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے سفید لٹھے کا ایک گز کپڑا پڑا ہوا تھا جسے اس نے گول مول کر کے سوئی کی صورت دی ہوئی تھی۔ یہ ایک گز کا لٹھا سرِ شام منگوا لیا گیا تھا۔ شہر کی فضا انسانی اور مشینی آوازوں سے خالی ہو چلی تھی۔ کہیں کہیں سے کتوں کا بھونکنا سننے میں آ رہا تھا۔ ایک پہر شاید گزرا ہوگا کہ امیراں آہستہ آہستہ جھومنے لگی اور اس کی زبان نے نامانوس الفاظ نکالنے شروع کیے۔ وہ الفاظ کمرے میں بیٹھے باقی لوگوں کو ایک "روں روں" کی طرح سنائی دے رہے تھے۔ پھر جھومنے میں شدت آنے لگی اور اور وہ چارپائی سے زمین پر کودی اور شرینہہ کے درخت کے نیچے جا رکی۔ ایک گز لٹھے کو اس نے سوئی کی طرح گھمانا شروع کر دیا تھا۔ شرینہہ کے گرد گھومتے اس نے اضطرابی انداز میں لٹھے سے کسی چیز کو محمد زمان کے کمرے کی طرف ہنکانا شروع کر دیا، جیسے وہ کسی ان دیکھے جانور کو پچکارتی اندر دھکیلتی آ رہی ہو۔ محمد زمان، اس کی بیوی اور بہن اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ مضطرب کیفیات میں مبتلا ان کے اجسام کی شریانوں میں خون پارے کی طرح گردش کر رہا تھا اور خیالات پر امید و بیم پہلو بدلے جا رہے تھے۔ امیراں باپ کی چارپائی کے گرد کپڑا اینٹھ رہی تھی۔

"چارپائی اٹھا کر یہاں کھودو۔" حکم کی تعمیل ہوئی اور محمد زماں کدال چلاتا کمرے میں زمین کھودنے لگا۔ کمرے میں کھڑے افراد کی نظر کدال کے ساتھ نکلی آنے والی مٹی پر تھی جس کے ہر ذرے کے ساتھ ان کی امید کا دیا جل اور بجھ رہا تھا۔ محمد زمان کدال مارتا گیا۔ چارپائی کی جگہ مٹی میں چند فٹ گہرا کھڈا جنم لے چکا تھا۔

"جلدی کرو، جلدی!" امیراں چلّانے لگی۔ محمد زماں کے ہاتھ تیز ہونے لگے۔ کھڈے نے اچھی خاصی شکل لے لی تھی مگر صرف مٹی نکلی آ رہی تھی۔ امیراں پر ہسٹریائی انداز چھانے لگا۔ اس نے

لٹھے کی سوئی نما کو گھماتے، کسی چیز کا تعاقب کرتے، بچوں والے کمرے کا رخ کیا۔ محمد زماں کی بیوی اور بہن اس کے ساتھ ساتھ ہی دوڑی گئیں۔ محمد زماں کدال ہاتھ میں لیے جب بچوں والے کمرے تک پہنچا، وہ کمرے کے ایک کونے کو گھیرے چیخے جا رہی تھی۔ چیخ پکار سے پریشان حال بچے اپنی اپنی چارپائیوں سے اترنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔

''اس کونے میں کھودو۔ اس میں کھودو!'' کی آواز پر لبیک کرتا محمد زماں پھر کھدائی میں شروع ہو گیا۔ کھدائی کرتے کرتے اب اس پر تھکن غالب آنے لگی۔ ادھر امیراں کی وحشت میں ہر لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''جلدی کرو، ورنہ دیگ نکل جائے گی!'' امیراں کی آواز اور عامل محمد زماں کے اندر بھری امیدوں نے اس کے ہاتھوں میں نئی قوت پیدا کر دی۔ وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ چلاتا گیا۔ ہر ضرب کے ساتھ نرم مٹی چری جا رہی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں مٹی کا ایک ڈھیر جنم لے چکا تھا۔

''آ خلیل، اب تھوڑی دیر تو چلا لے۔'' عامل محمد زماں کی آواز اس کے تھک جانے کی تعبیر بیان کر رہی تھی۔ خلیل آگے آیا۔

''خبردار جو کھلیل نے کدال کو ہاتھ بھی لگایا!'' امیراں چیخی۔ محمد زماں نے کچھ کہنے کی جرأت نہ کی۔ اس کے تھکے ہاتھ کدال پر مضبوطی سے جمے اور پھر حرکت میں آنے لگے۔ اب امیراں کے ساتھ اس کی بیوی کی آواز بھی ''جلدی! جلدی!'' کہتی سننے میں آ رہی تھی۔ محمد زماں کے اندر جو پہلے صرف دفینہ کی امید بھری تھی، اب خواہ مخواہ کا ایک خوف بھی جگہ بنانے لگا۔ کدال سے زمین پر لگتی ضرب کمزور پڑنے لگی۔ تھکن محمد زمان کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن کو بھی برمے کی طرح چیرتی گئی۔ اچانک محمد زماں کونے میں کھدے کھڈے میں گرا ہوا نظر آیا۔ محمد زماں کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنا منہ گیلا اور اپنے آپ کو چارپائی پر پڑا محسوس کیا۔ اس کے حواس واپس ہوئے تو دیکھا، امیراں چیخے چلائے جا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''سب کھتم ہو گیا، سب کھتم۔'' امیراں اس کے اوپر آ کھڑی ہوئی۔ ''اب کھلیل کو نہ چھوڑوں گا۔'' امیراں یہ کہتے خلیل کے قریب ہونے لگی۔ عامل محمد زماں میں اس کے سامنے جانے کی سکت نہ تھی۔

''خبر دار! ایک پاؤں آگے بڑھایا تو بھسم کر دوں گی۔'' محمد زماں کی بیوی امیراں اور خلیل کے درمیان کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ''مجھے سائیں مست علی چھاہ نے بھیجا ہے۔ کیا سمجھتے ہو کھد کو؟ مجھ پر تمھارا کوئی جادو نہیں چلے گا۔ تو کھلیل کو ہاتھ لگا کر تو دیکھ، یہیں کے یہیں ذرہ ذرہ نہ کر دوں تو کہنا۔'' عامل محمد زماں کی بیوی کے الفاظ نہیں، تیر تھے جو میر غضب خان سے دوبدو مقابلے پر للکار رہے تھے۔ امیراں پاؤں پاؤں پیچھے ہٹتی گئی۔ اس کا غصہ اور وحشت گم ہونے لگے۔ ''نکل اس کمرے سے، کتی، کمینی!'' محمد زماں کی بیوی آگے ہوتے حکم دیتی گئی۔ امیراں ہٹتی کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ ''میں تمھیں کہتی ہوں کہ اگر کل تک امیراں سے نہ نکلا تو میں تجھے اس چولھے میں جلا ڈالوں گی۔'' محمد زماں کی بیوی نے امیراں کو بالوں سے پکڑ کر صحن میں ایک طرف بنے چولھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ امیراں کا سر اٹھ نہیں رہا تھا۔ ''مجھے کالی چائے پلاؤ۔'' محمد زماں کی بیوی نے محمد زماں کی بہن کو حکم دیا۔ محمد زماں کی بیوی نے کالی چائے کا پیالہ ختم کیا تب تک محمد زماں صحن میں نکل آیا تھا اور امیراں نیچے مٹی پر سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔ ایک لفظ کہے بغیر۔

''سن لے کتے! سائیں نے کہا ہے، اگر تو کل تک نہ گیا تو سائیں مست علی چھاہ تمیں ادھر آ کر جلا کر کھاک کر دیں گے۔'' محمد زماں کی بیوی کی آواز نہیں ایک گرج تھی جو ہر طرف گونجے جا رہی تھی۔

دوسرے دن میر غضب خان کی فرمائش پر عامل محمد زماں شہر بھر کے پھول والوں سے پانچ من گلاب کے پھول خرید کر کے گدھا گاڑی پر لدوا لایا۔ ان پھولوں کو ایک چارپائی پر بچھایا گیا اور اس رات امیراں اس چارپائی پر لیٹی اور میر غضب خان کا اس گھر میں یہ آخری دن تھا۔ یہ واقعہ گھر تک ہی رہا اور باہر نہیں نکلا۔ شہر والے صرف یہ جانتے ہیں کہ ایک صبح قبرستان کی ساری قبریں گلاب کے پھولوں سے مہکی جا رہی تھیں۔

❊❊

مونچھ میں اٹکے ایک قطرے کی کہانی

جیم عباسی کی کہانیاں پچھلے چند برسوں میں آج سمیت کئی ادبی رسالوں میں شائع ہو کر پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر چکی ہیں۔ اس بار ان کی ایک لمبی کہانی شائع کی جا رہی ہے جو ان کے ادبی سفر کی پیش رفت کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ اس میں ان کا موضوع اور اسلوب، دونوں زیادہ ترقی یافتہ صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ سندھ کے دیہی پس منظر میں اتنی موثر کہانیاں اردو میں اس سے پہلے سامنے نہیں آئیں۔ اس کہانی کی اشاعت کے وقت جیم عباسی اپنا ناول رقص نامہ بھی مکمل کر چکے ہیں جو آج کے ذریعے جلد ہی پیش کیا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ زیرِ نظر کہانی کے لکھنے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی سندھی کتاب ریتوں رسموں، سوٹ ساٹھ سے بھی مدد لی گئی۔

جیم عباسی (اصل نام جمیل عباسی) 1978 میں سندھ کے مقام کنڈیارو میں پیدا ہوئے، جو اس وقت ضلع نواب شاہ میں تھا اور اب نوشہرو فیروز ضلعے کا حصہ ہے۔ انھوں نے کنڈیارو ہی میں مذہبی نوعیت کی تعلیم حاصل کی اور وہیں پرورش پائی، اور بعد میں حیدرآباد اور پھر کراچی منتقل ہوئے جو اب ان کا گھر ہے۔

ناک کی سیدھ میں جاتی سڑک کو کنارے کنارے کھڑے درختوں کی شاخوں نے مل کر محراب دار کر دیا تھا۔ دونوں قطار درخت ایسے گھنے اور آپس میں گتھے ہوئے تھے کہ جیسے نہر کا بلند پشتہ۔ یہ کچی سڑک سیدھے جا کر گاؤں کے پاؤں کو چھوتی اور پھر دائیں طرف منھ کر کے دیگر گوٹھوں کی طرف چلی جاتی۔ گاؤں ایک ٹیلے اور اس کی اترائی پر کھڑا تھا۔ ہیئت ایسی کہ درمیانی حصہ کسی گنبذ (گنبد) کی طرح دور سے نظر آنے لگتا اور قریب جاؤ تو گھروں کی کچی اور ٹیڑھی میڑھی دیواروں کا ایسا بے ہنگم مجموعہ جیسے مختلف قد کے ایک صورت لوگ قطار میں سیدھا کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سو گھر ہوں گے، کچی اینٹوں سے بنے، جن پر گارے کا لیپ انھیں یک جان کر دیتا تھا۔ محراب دار سڑک جس جگہ گاؤں کو چھو کر مڑتی تھی وہاں گھیراؤ میں ایک میدان تھا جس پر جٹا دار برگد چھاؤں کیے کھڑا تھا۔ برگد کی اونچائی دو منزلہ گھر سے کم نہ ہو گی اور چھاؤں ایسی میٹھی کہ اس کے نیچے بیٹھتے اونگھ آنے لگتی۔ کلو موالی کا قول تھا کہ اس برگد کو بھنگ پلا کر بڑا کیا گیا ہے۔ برگد کے گرد ایک مختصر چبوترا بنا تھا جو اس کے جسیم تنے کے گھوم جاتا تھا۔ یہ چبوترا اٹھنے اور لیٹنے کے کام آتا۔ اس پر ایک گھڑونچی رکھی تھی جس پر تین مٹکے پیٹ پھلائے پڑے رہتے تھے۔ ماما پیرل کا پورا خیال ہوتا کہ ایک بھی خالی نہ رہے۔ ماما پیرل علاقے (علاقے) والوں کے لیے تو پیرل ترخان تھا مگر گاؤں بھر ماما پیرل کے نام سے ہی اسے جانتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے بچے بھی اسے ماما ہی کہتے۔ ماما کا چھپر برگد کے مغربی طرف کھڑا تھا جس کے اگواڑ ایک لمبا ٹیبل نما تخت رکھا تھا جس پر وہ دروازے، کھڑکیاں، چارپائیاں، گھڑونچیاں اور کلہاڑی کے دستے وغیرہ بنانے کا کام انجام دیتا تھا۔ چھپر کے اندر ایک صندوق اور ایک لکڑی کی الماری رکھی تھی جو دونوں بغیر تالے بند رہتی تھیں۔ صندوق کے اندر ماما پیرل کے اوزار بھرے تھے اور الماری روزمرہ کی اشیا، تیل صابن سے زیادہ بچوں کے کھانے پینے کی چیزوں سے بھری تھی۔ گاؤں میں ایک بڑا اور ایک چھوٹا ہٹ بھی موجود تھا لیکن گاؤں بھر کے بچوں کا رخ ماما پیرل کی طرف ہوتا تھا۔ بکری اتنی تھی کہ روز صبح

شہر سے سامان خریدنے جانا پڑتا۔ وہ اپنی بنا بریک سائیکل کے کیریئر پر دونوں طرف سامان رکھنے والے ڈول لٹکائے، محراب دار سڑک پر واپس آتا دکھائی دیتا تو اس کے انتظار میں برگد کے نیچے کھڑے بچے اس کی جانب دوڑ پڑتے۔ پھر اسی طرح اچھلتے کودتے اس کی سائیکل کے ساتھ ساتھ واپس آتے۔ ماما پیرل ترنگ میں لہکتے ہوئے سائیکل چلاتا آتا۔ سائیکل کے ایک پیڈل کو دباتے ہوئے وہ اپنے چھوٹے قد کے ساتھ اس طرف ڈولنے لگتا اور پھر دوسری طرف کا پیڈل اسے اپنی طرف کھینچنے لگتا۔ ڈولتے ہوئے اس کے سانولے منھ سے بچوں کے لیے تواتر سے ایک آواز ابھرتی جاتی: ''ہٹ جاؤ تمھاری نانی مرجائے، ہٹ جاؤ تمھاری نانی مرجائے۔'' مگر اس کی اس بات کا کھلکھلاتے بچے کوئی اثر نہ لیتے۔ وہ اس کے آگے اور دائیں بائیں دوڑتے آتے۔ برگد کے نیچے پہنچ کر وہ اپنے گول مٹول اور تھلتھلاتے وجود کے ساتھ سائیکل سے اترتا اور اپنی بنا بریک سائیکل روکتے گھسٹتا جاتا۔ کبھی کوئی بیٹھا ہوا سائیکل کی حالت پر جملہ نکال بیٹھتا:

''ماما، اب تو جباب (جواب) دے گئی ہے۔ چھوڑ اس کی جان۔''

''یار، ہم کوئی بھگا کے لے آئے ہیں اسے جو جان چھوڑ دیں؟''

ماما کے جواب پر بیٹھے ہنس پڑتے۔

''ہلا! پھر اس کہ بریک تو لگوا دے۔''

''ہم ہی بنا بریک ہو گئے ہیں۔ سنے گا؟'' یہ کہہ کر ماما ایک خاص صورت بناتا۔ کہنے والا بھاگنے کے چکر میں پڑتا مگر وہاں موجود کوئی ایک اسے پکڑ کر ماما کے قریب لے جاتا۔ ماما ایک یاد داغ کر بدبو مٹھی میں کرتا اور لے جا کر اس کی ناک پر چھوڑتا۔ ہنسی کا غل مچ جاتا۔

''اسے تو دیکھو! ہماری ہی بریک ڈھیلی ہو گئی ہے اور یہ یار چلا ہے سائیکل میں بریک لگوانے۔ آیا مزہ؟'' ماما بات کے آخر میں پھر ایک سوال اسی کی طرف اچھالتا۔ جواب میں اس شخص کو ہاں کار میں سر ہلانا پڑتا ورنہ ایک اور یاد داغے جانے کے لیے تیار ہوتا۔

ماما کی شہر سے واپسی ہو گئی ہے مگر اس کے گراہک اپنی اپنی جگہ چبوترے پر جمے بیٹھے ہیں۔ کسی کو چارپائی کا پایہ ٹھکوانا ہے تو کسی نے بیلوں کے لیے پنجاری بنوانی ہے مگر انھیں اس وقت تک

پنجاری: بیل جوتنے کا جُوا۔ پنجابی۔

انتظار کرنا ہے جب تک ماما بچوں کو ان کی کھٹی میٹھی اشیا دے کر فارغ نہیں ہو جاتا۔ بچوں نے وڑو، میٹھی گولیاں اور بنانا بسکٹ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے ہیں۔ کچھ لائی کو دانتوں سے کتر رہے ہیں تو کچھ کے ہاتھ مٹھائی سے سنے ہوئے ہیں، مگر سب کے سب جتھے کی صورت بنائے برگد تلے کھڑے ہوئے ہیں۔

''اڑے، جاتے کیوں نہیں؟'' ماما مصنوعی غصے سے پوچھتا ہے۔

''نہیں جائیں گے!'' بچے اکڑ کر جواب میں چلاتے ہیں۔

''نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں جائیں گے!'' سب یک زباں ہو کر کہتے ہیں۔

''کروں کاروائی؟'' ماما جھک کر تہبند کو پنڈلی سے گھٹنوں تک اٹھاتا ہے۔

''بھلے کرو!'' بچوں کے منھ سے ہنسی ابلی آرہی ہے۔ ماما جھک کر ایک بڑا پاد چھوڑتا ہے۔ آواز کی گونج سنتے ہی قہقہے مارتے بچے اوندھا اوندھ ہوتے برگد سے گاؤں کی طرف اوپر چڑھتے راستے پر دوڑ پڑتے ہیں۔ اب ماما کے گراہک قریب ہو کر اپنا کام کہہ سکتے ہیں۔

''ماما، تو نہیں سدھرے گا!'' کوئی ہنستے ہوئے چوٹ مارنے کی کوشش میں ہے۔

''تو سدھرے گا کہ نہیں؟'' ماما پھر خاص انداز اپنانے لگتا ہے۔

''نہ نہ! بس بس! ماما، میری کیا میرے باپ کی توبہ۔''

''جھل دب!'' کہتے ماما اوزاروں کی پیٹی کھولنے لگتا ہے۔ اتنے میں دین محمد عرف دینو نے پنجاری تختے پر آرکھی۔

''ہاں دینو چاچا۔ کر خبر؟ کیا کرنا ہے؟ دو ٹکڑے کہ تین؟''

''ماما، تین کر کے دو، چاچی کو جلانے میں سہولت ہوگی!'' علی حسن جو اپنی چارپائی بنوانے آیا ہوا ہے، بول پڑتا ہے۔

وڑو: ایک مٹھائی جو پگھلے ہوئے گڑ پر بھنے ہوئے چاول کے دانے ڈال کر بنائی جاتی ہے۔

لائی: یہ گڑ اور تلوں کو ملا کر بیلن سے بیل کر بنائی جاتی ہے۔ سندھ سے باہر کئی علاقوں میں اسے چکی یا چنی بھی کہا جاتا ہے۔

''تیرے باپ کی ہے جو نکڑے کروا رہا ہے؟'' یہ بات سن کر دینو کا انگارے جیسا مزاج سلگنے لگتا ہے۔

''چاچا، بابے کی پنجاری ہوتی تو تجھے نہ جوت دیتے اس میں۔''

''اور بھونک اور! میں تو کب سے کہہ رہا تھا کہ علو اور گوہ نہ کھائے، ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ اور تو منہ بند کیے کھڑا ہے، ہاں؟ میں تیری دکان پر آیا ہوں نا؟ تیرے سامنے میری بے عزتی ہو رہی ہے اور تو ایسے ہی کھڑا ہے؟'' چاچا دینو علو کے ساتھ ماما کے لتے لینے لگا۔

''اڑے علو اٹھ! چاچے سے مافی (معافی) مانگ۔''

''چاچا دینو، ماف کرنا، مڑئی گتھو لفظ زبان سے نکل گیا۔ زبان چام کی، کسی نہ کام کی۔'' علو اٹھا اور کندھے پر پڑا پھولدار رومال چاچے دینو کے پاؤں پر رکھ دیا۔

''مافی مانگنے آیا ہے! شکل ہے مافی والی؟ حرامی کس جائے کا! میں بس جا رہا ہوں۔'' دینو نے تختے پر رکھی ٹوٹی پنجاری کندھے پر رکھ دی۔

''اڑے چاچا، بس بس! ٹھنڈا ہو۔ گریب (غریب) نے مافی تو مانگی ہے، اور کیا کرے؟'' ماما نے چاچے دینو سے پنجاری چھین کر تختے پر ڈال دی۔

''یہ کوئی مافی ہے؟''

''تو بھلا اونٹھ پاؤں بنائے؟''

''چاچا دینو، تو کہے تو اونٹھ پاؤں بناؤں، قسم سے!'' علو اونٹھ پاؤں بنانے کے لیے اٹھنے لگا۔

''اڑے بڑی خبر ہے تیرے اونٹھ پاؤں کی! بڑوں کی کوئی شرم حیا ہی نہیں۔'' چاچا دینو غصے کی منزل سے اتر کر روٹھنے پر آ پہنچا ہے۔

''چاچا، بس کیا کروں، قسم سے جس دن میں پیدا ہوا اس دن ساری شرم تقسیم ہو گئی تھی۔'' یہ دیکھ کر علو پھر پر تولنے لگا۔

''منہ بند نہیں کرتا لوسی!'' ماما نے علو کو گھرکی دی۔ ''چاچا دینو، مجھے یہ بتا یہ ٹاہلی کی لکڑی ہے، ٹوٹی کیسے؟''

گتھو: خراب۔ اونٹھ پاؤں بنانا: کچی مٹی پر چوتڑ رکھنا۔

''یار، بس کیا بتاؤں، منڈی سے وہ جو پار سال تھری بیل نہیں لایا تھا؟ کل ریج کے بعد سانھر گھمار ہا تھا، بھتارے نے گردن جو جھٹکی، پنجاری توڑ کر رکھ دی۔ اب کھیت میں ریج لگا پڑا ہے، پنجاری بنے تو سانھر گھماؤں۔''

''چاچا، ابھی بن جاتی ہے۔ تو فکر ہی نہ کر۔''

''ادا دینو، ونگار بنگار کی ہے یا نہیں؟'' یہ میاں فضل محمد تھا۔ بارعب، قد آور۔ ویسے تو گاؤں میں کوئی وڈیرا نہ ڈھیرا نہ تھا پر سارے میاں فضل محمد کو آگے رکھتے تھے۔

''نہ ادا فضل نہ! بس دو تیلیے ہیں، خود لگا لیں گے۔''

ماما پیرل پنجاری کو ٹھیک کرنے میں جت گیا۔ چبوترے پر چلتی باتوں میں اپنا حصہ بھی ڈال رہا تھا۔ پنجاری بنا کر چاچے دینو کو تھمائی گئی۔ چاچا کندھے پر رکھے گاؤں کی طرف چڑھائی پر جانے لگا۔

''اڑے علو! لے آ اپنی چارپائی۔ دیکھیں تو اسے۔'' ماما نے علو کو آواز دی۔

''علو! چارپائی تیرے باپ نے توڑی ہے یا تو نے؟'' کندھے میں پنجاری ڈالے جاتا چاچا دینو حساب برابر کرنے کھڑا ہو گیا۔

''چاچا دینو، بس کیا بتاؤں۔ ابے کی عمر تو نے دیکھی ہے، تجھ سے کوئی سال دو چھوٹا ہو گا۔ اب چارپائی توڑنے کے لیے جو طاقت چاہیے وہ تو ابے کے پاس تیری طرح بچی نہیں۔ اب چارپائی میں توڑتا ہوں، ابا تیری طرح مٹکے توڑتا ہے۔'' علو کی بات نشانے پر لگی۔ پورا چبوترا ہنسا۔

''ایسا شک ہے تو رات سو میرے ساتھ۔ پیٹ سے نہ کروں تو کہنا!'' چاچا دینو لوٹ آیا۔

''چاچا، چھوڑ اب باتیں۔ بھلا ایسی بات ہے تو پہلے چاچی کو پیٹ کر کے دکھا۔ پھر تیرے ساتھ میں نہ سوؤں تو کہنا۔''

تھری بیل: تھر کے علاقے کا بیل جو اپنے لمبے اور خوبصورت سینگوں کی شہرت رکھتا ہے۔
ریج: چاول کی فصل کے لیے کھیت کو پانی سے بھرنے کا عمل۔
سانھر: کھیت ہموار کرنے کا اوزار۔ بھتارا: بخت والا۔ بھاگوان۔
ونگار بنگار: کام زیادہ ہو تو مل جل کر کیا جاتا ہے۔ جیسے بوائی یا کٹائی کا کام۔ کھیت مالک گاؤں والوں کو کام کا دن بتاتا ہے اور ان کے کھانے کے لیے چاول بنواتا ہے۔ جو سارے مل کر کھاتے ہیں۔ اردو میں اسے بیگار کہتے ہیں۔

''اڑے چاچا، اب تو جا۔ رنج لگا پڑا ہے۔ چھوڑ ان باتوں کو۔ اس حرامی کے منہ کوئی لگتا ہے؟''
ماما پیرل نے چاچا دینو کو دھکیل کر روانہ کیا جو علو کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ ''اڑے علو، لخ لعنت ہو! نہ چھوٹوں کو بخشتے ہو نہ بڑوں کو۔'' ماما پیرل نے علو کے منہ پر لعنت رکھی۔

''ماما، بھلا تم چھوڑتے ہو؟'' علو ہنسی میں شرابور تھا۔

''اڑے اب بس کر! یا کروں کاروائی؟''

''چھوڑ ماما! اب تیرے عضوے بھی ڈھیلے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو جو تو کاروائی کے خیال میں ہو اور کچرا باہر آ پڑے۔'' علو کی اس بات پر اتنا زوردار قہقہہ پڑا کہ برگد کی جٹادار شاخیں بل کر رہ گئیں۔

''بڑا بے حیا ہے تو! ایسا کنجر میں نے حیاتی میں نہ دیکھا۔'' ماما پیرل کام چھوڑ کر پھر ایک بار علو کے منہ پر لعنت رکھنے آیا۔ ''اب ایک بات بتاتا ہوں تم لوگوں کو پچھلے سال کی۔'' ماما چبوترے پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

''میری چارپائی والا کام تو پورا کر ماما!''

''تو اس وقت اس پر جا کے سوئے گا؟ لوسی کہیں کا۔ چپ کر کے سن بات۔''

ایک دو اور نے بھی علو کو گالی دے کر منہ بند کرنے کا کہا۔ سب ماما پیرل کی بات کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''یہ پچھلی گرمیوں کی بات ہے جب میں نے دوسری شادی کی تھی۔ میں شادی کا سامان لینے گیا تھا بڑے شہر۔ کپڑے وپڑے، برتن ورتن، جوتے چپل لے کر گٹھڑی سر پر رکھی اور اسٹاپ کی طرف آ رہا تھا۔ بیچ بازار میں تھا کہ ہوا کا خیال ہوا۔ ہمیں اپنے گوٹھ کی عادت، مروٹا سروٹا دے کر میں نے کاروائی کر دی۔ ابا کیا بتاؤں، پتا مجھے تب لگا جب ایڑی چپل سے چپکنے لگی۔ شہر پرایا، لوگ پرائے۔ بیچ بازار! میں نے کہا، پیرل، آج تو نہ مرے تو کب مرے؟ سارے ملک میں خوار ہو گا تو!''

برگد کے نیچے ہنسی کا جہاں آباد تھا۔ لوگ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسی میں ڈوبے جا رہے تھے۔

''پھر کیسے نبھائی بات ماما؟''

''یار، حد کرتے ہو! گو کی بات ہے، نبھانا وری کیسا؟ بس میں بھی چوروں کی طرح تلیوں پر

چلنے لگا۔ پر یار کوئی گاڑے والا تھا سوَر، اس کی نگاہ پڑ گئی۔ حرامی بڑے منہ سے بولتا ہے، چاچا دھوتی سنبھال دھوتی! میں نے دیکھا ہی نہیں، بس جباب دیا، ہاں ہاں، بھینس کا گوبر لگا ہے۔"

لوگوں کو پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"پھر ماما؟"

"اور کیا منہ کالا کروں اپنا؟ ساری بات تو بتادی۔"

"گوٹھ کیسے پہنچے؟"

"ہاڈیار، یہ بات رہ گئی! وہ اپنا رئیس کنال نہیں ہے؟ بس اس کے کنارے جا کر اس میں چھلانگ ماری۔ دھو دھلا کر نکلا۔ جوتی دوتی دھو کر بس میں آ بیٹھا۔ گھر آ کر دیکھا تو نشان سارے پیلے لگے پڑے تھے۔ بس وہ دن اور یہ دن، اب کاروائی میں زور زبردستی کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ سو علو، عمر برابر عمر ہوتی ہے۔" ماما علو کی پیٹھ تھپک کر تختے کی طرف اٹھ گیا۔ "بھلا علو، تیری چارپائی کی ملم پٹی (مرہم پٹی) کروں یا پورا بازو بدلوں؟" ماما وہیں سے پکارا۔

"ماما، یہ ملم پٹی اپنی چارپائی پر کرنا۔ ہمارا زور زور ہے۔ بازو بدل بازو!"

"اڑے اب بس کر! ہم ہیں سچے گھی کی جم پل۔ تو ڈالڈا کی پیداوار!"

"ماما، ایسی بات نہیں۔ ہم بھی گھی مکھن پر بڑے ہوے ہیں۔"

"گھی مکھن پر بڑے ہوے ہیں..." ماما نے اس کی نقل اتاری۔ "پتا ہے تیرے مکھن کا، گائے کا مکھن کھاتا ہے! وہ بھی کوئی مکھن ہے؟ ادا، بھلا تم انصاف کرو، ہے کوئی مقابلہ گائے کا بھینس سے؟" ماما وہاں بیٹھے ہوے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"نہ سائیں! کہاں بھینس کہاں گائے۔ کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔"

"ماما، کون سی بھینس تیرے گھر کھڑی ہے؟" علو نے ماما پر چڑھائی کی۔

"اڑے میرے گھر نہیں تو کیا ہوا؟ بہن کے گھر تو ہے نا۔ اس کا اور میرا گھر کوئی الگ بات ہے؟" اتنی دیر میں گاؤں سے اترتے راستے پر کوئی دوڑا آیا۔

"ماما، ماما! ماسی پوچھ رہی ہے مچھی لے آئے؟" یہ فرید تھا۔ ماما کا اپنا بیٹا۔

رئیس کنال: رائس کینال، جو انگریز دور میں چاول کے علاقے کی آبپاشی کے لیے بطور خاص بنوایا گیا۔

''اڑے گھوڑا! دیکھا علو، تیری باتوں سے میں بالکل بھول گیا۔اڑے واروکر، فرو (فرید)۔یہ چھلی سائیکل میں ٹنگی ہے۔ جلدی لے جا، مچھی خراب نہ ہوجائے۔'' ماما بوکھلا گیا۔

''ماما پیرل، پھر مطلب کہ کام مچھی پر چل رہا ہے؟'' علو معنی خیز انداز میں بول پڑا۔

''لخ لعنت ہو تم پر! اڑے حرامی، گھر والی کے مٹ مائٹ (رشتے دار) آرہے ہیں۔لیکن بات تو سُن...'' ماما نے رخ علو کی جانب کیا۔''یہ بتا، تجھے مچھی کے اثر کا پتا کیسے لگا؟ ہوں؟'' ماما کی بات پر علو کی مونچھیں جیسے ڈھلک پڑیں۔ قہقہے تھمنے کے بعد بھی علو سے بات بن نہ پائی۔

ماما پیرل رندے سے لکڑی چھیلے جا رہا تھا۔ رندے کا لوہی بلیڈ لکڑی کی پرتیں اتارے جا رہا تھا۔ جب بلیڈ پرت اتارتا تو رندے کی آواز بدل جاتی اور لکڑی کے باریک ذرّے ہوا میں اڑنے لگتے۔ تختے پر رکھی لکڑی کے، جسے لوہے اور لکڑی کے شکنجے جکڑے ہوئے تھے، آس پاس ان ذرّوں کی ریشم جیسی نرم ڈھیریاں بن رہی تھیں۔ ماحول میں چھلتی لکڑی کی خوشبو تھی۔ چڑھتے سورج کے ساتھ برگد کے نیچے آمدرفت زیادہ ہوگئی تھی۔ آتا جاتا سلام اور حال احوال کرنے برگد کے نیچے رکتا اور پھر سانس لے کر، پانی پی کر اپنے کام چل دیتا۔ ماما پیرل رندا تیز تیز چلا رہا تھا۔ اس کے من میں جلد گھر جانے کا خیال تھا۔آج بیوی کے رشتے دار آنے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پہنچ کر مہندی رنگ لے۔ یہ کام بھی اس نے دوسری شادی کے بعد شروع کیا تھا۔

ماما نے پہلی بیوی کے گزر جانے کے بعد دوسری کی تھی جو اگرچہ اس کے قوم قبیلے کی نہ تھی مگر پیرل اس پر جی جان سے عاشق ہوگیا تھا۔ وہ کام کے دوران بھی گھر جانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا۔ پہلے جو پینگھا وہ دنوں میں بناتا تھا، اب ایک ماہ کا وقت لے جاتا۔ اس وقت علو کی چارپائی کا بازو مکمل کرتے اسے گھر جانے کا خیال لگا ہوا تھا۔ کام مکمل کرکے اس نے چارپائی علو کے حوالے کی اور کلہاڑی کا دستہ بنوانے آئے ہوئے دوست محمد عرف دوسو کو کلہاڑی تختے پر چھوڑنے اور شام کو لے جانے کا بول کر گھر چل پڑا۔ گھر پہنچتے ہی مہندی کا کٹورا لے کر آنگن میں نیم کے نیچے آبیٹھا۔ ویسے تو پیرل جمعے کے جمعے

وارو: جاری۔ چھلی: کھجور کے پتوں سے بنی تھیلا نما ٹوکری۔

مٹ مائٹ: عزیز رشتے دار۔

مہندی کرتا تھا مگر اس نے کل شام شیشے میں دیکھا تھا کہ مہندی مونچھوں کی جڑ چھوڑ چکی تھی، اس لیے رات کو ہی اس نے بیوی کو مہندی بھگو دینے کا کہہ دیا تھا۔ مہندی بھی وہ بیوی سے لگواتا تھا مگر اب پچھی دیر سے بھیجنے کی وجہ سے بیوی کام میں لگی ہوئی تھی۔ اسے بھی کہنے کا من نہ ہوا، حالانکہ دل اس کا بہت کر رہا تھا کہ وہ اپنی دل کی رانی سے مہندی لگوائے۔ وہ جب اپنی انگلیوں سے اس کی مونچھوں اور سر کے بالوں میں مہندی لگاتی تھی تو پیرل پر نشہ چھا جاتا تھا۔ خمار میں آ کر اسے دنیا بھول جاتی۔ لذت کی لہریں اس کے جسم میں کپکپا جاتیں۔ وہ سکون میں آ جاتا۔ پیرل نے پہران اتار کر بیر کی شاخ میں ٹانگا اور مہندی والا کٹورا لے کر کھٹولی پر بیٹھ گیا۔

''ماما، میں مہندی لگاؤں؟'' اس سے سکینہ نے سوال کیا جو اس کی پہلی بیوی سے پہلوٹی اولاد تھی۔

''اماں، تو مہندی لگا لے گی؟''

''جیسے ماسی نہیں لگاتی، وہ میں نے دیکھی ہے۔ لگا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ یہ پکڑ۔'' پیرل نے اس کے ہاتھ میں مہندی والا کٹورا پکڑا دیا۔ سکینہ جو پہلی بار باپ کو مہندی لگانے کھڑی ہوئی تھی، اناڑی پن کے ساتھ باپ کے سر پر مہندی تھوپنے لگی۔

''ماما، یہ مہندی میں ماسی سرسوں کا تیل کیوں ڈالتی ہے؟''

''اماں، اس سے مہندی کھال پر نہیں چڑھتی۔ تو ایسے نہ لگا اماں، تھوڑی تھوڑی اٹھا کر جڑوں میں لگا۔ بالوں کے اوپر نہیں، اماں۔ یہ دیکھ، ایسے۔'' پیرل بیٹی کو مہندی لگا کر سمجھانے لگا۔ اتنی دیر میں ہانڈی چولھے میں الجھی سلیمت کی نظر مُرس پر پڑی۔

''ائی! مجھے کیوں نہیں کہا؟'' وہ ہوا کے جھونکے کی طرح سر پر آ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے دے مہندی، سکیناں۔ تو جا کر دیگچی دیکھ، میں تیرے باپ کو مہندی کر کے ابھی آئی۔''

''تو اپنا کام دیکھ دلڑی، مہندی خود لگ جائے گی،'' پیرل نے سلیمت سے کہا جواب کٹورا سنبھال کر مہندی لگانے لگی۔ اس کی انگلیوں نے مہندی کرتے پیرل کے بالوں کی جڑوں کو چھوا تو پیرل کے اندر پھریری دوڑ گئی۔ اس کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ سسکاریاں نکلنے لگیں۔ ''تیرے مٹ مائٹ پہنچنے والے ہوں گے، تو ڈوئی سنبھال!'' پیرل نے پھر کہا مگر اب کے کہنے میں ایک ناز تھا جو جواب سننے

مُرس: شوہر، مرد۔ دلڑی: دل کی تصغیر۔

کے شوق میں تھا۔

''نہ سائیں! مجھے مٹ مائٹ تم سے بڑھ کر ہیں کیا؟''

پیرل کے دل میں پھوار برسی۔ وہ کھٹولی پر اور پھیل کر جم گیا۔ بیری کے نیچے بیٹھا پیرل مہندی کی ٹھنڈک اپنے اندر اترتی محسوس کر رہا تھا۔ ابھی بیری پر پھل آنے کا وقت کافی دور تھا ورنہ اس کے بیر کترتے طوطے 'ٹیوں ٹیوں' کا راگ الاپ رہے ہوتے۔ اس بیری کے عاشق صرف طوطے ہی نہ تھے بلکہ یہ صوفی بیر گاؤں بھر کے بچوں کی پسند تھی۔ بیری کے اس قسم پر لگنے والے بیر عام بیروں سے جسامت میں بڑے اور رس دار ہوتے تھے، جیسے ان کے اندر شیرہ بھرا ہوا ہو۔ ورنہ گاؤں، کھیتوں میں بیریاں تو بہت۔ اکثر بیریاں تُرش، گلا جا پکڑتیں۔ اس بیری پر بیر آنے لگتے تو گھر میں بچوں کی آمد رفت بڑھنے لگتی۔ وہ آتے اور بیروں کے پکنے کا اندازہ کر کے لوٹ جاتے اور پھر شام میں آ کر بیروں کو گھورنے لگتے۔ انھیں سمجھ نہ آتی کہ اتنی دیر کے باوجود وہ ویسے کا ویسا کیسے ہے؟ وہ پھر مایوس مایوس واپس ہو جاتے۔ یہی بیری اگر کسی اور جگہ ہوتی تو اس پر پتھر روڑے برسانے لگتے لیکن یہ تو ان کی اپنی تھی۔ اس لیے اگر کوئی زیادہ اُتاوَلا ہو جاتا تو ماموں پیرل سے جھول جاتا۔

''ماما، یہ بیر پک کیوں نہیں جاتے؟ کب پک جائیں گے بھلا؟''

''بابا، دیر ہی نہ لگے گی۔ بس شام یا کل!'' ماما کا جواب ہمیشہ ایسا ہی ہوتا۔ وہ خوش خوش جا کر خواب میں بیر کھانے لگتے۔

جیسے جیسے بیر پیلے ہو کر سبز پتوں میں دمکنے لگتے، بچوں کے ہونٹوں کے کونے رال بہانے لگتے۔ ماما سے بیروں کی فرمائشیں بڑھتی جاتیں۔ بیر توڑنے والے دن تو گھر کے باہر بڑے بوڑھے بھی انتظار کرنے لگتے۔ اس دن بیری کے نیچے وہ شور پڑتا کہ طوطے بھی بیر بھول کر بھاگ جاتے۔ ماما بیری کے تنے سے اٹکا ہوا ہے۔ درخت ہلا ہلا کر بیر گرانے ہیں۔ بھلا پتھر جوتا مار کر کوئی کھانے کی چیز ہاتھ کی جاتی ہے؟ ماما تنے کو ایک طرف سے جھنجھوڑنے میں لگا ہوا ہے تو دوسری طرف سے بچے اپنا زور لگائے جا رہے ہیں۔ خوشی میں بھرے بچے تنے سے چمٹ کر ''آ! آ!'' کی آوازیں لگاتے جوش میں تنے پر چڑھ جاتے۔ بیری کے نیچے موجود ہر سر اوپر اٹھا ہوا ہے۔ فائدہ مند جگہ کے لیے دھکم دھکا ہو رہی ہے۔ ہر ایک نے جھولی پھیلائی ہوئی ہے۔ بیروں کو ہاتھ کرنے کے لیے تتلی کی مانند اِدھر اُدھر اڑے جا رہے ہیں۔ جبو

(حبیب) کی جھولی بھر جاتی ہے۔ بھری جھولی دیکھ کر صدورا خود کو روکنے سے معذور ہوگیا۔ اس نے جبو کی جھولی سے مٹھی بھر لی۔ اِدھر جبو کی ''آں'' ابھری، اُدھر سے ماما کرُ کا، ''اوئے صدورے، تیری نانی مر جائے، واپس رکھ!'' صدورے کی شکل بھیگے مرغے کی طرح ہوگئی۔ اس نے مٹھی واپس پھینکی اور ماما کی نظروں سے بچنے کے لیے ہجوم میں غوطہ مار کر دوسری طرف جانکلا۔

''دیکھ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں تجھے صدورے پدورے!'' ماما کی نظر سے کوئی کیسے بچے۔ اب بیر ٹپاٹپ گر رہے ہیں۔ جو جھولی سے بچ کر نیچے گر جاتا ہے اس پر بچے یوں جھپٹتے ہیں جیسے باکو جلیبی والے کی جلیبیوں پر مکھیاں۔

مگر یہ وقت ابھی دور ہے۔ ابھی تو ماما مہندی لگوا کر برآمدے میں بیٹھا مہندی سوکھنے کا منتظر ہے۔ اس کی بیوی سلیمت اور بیٹی سکینہ مہمانداری کے بندوبست میں ہیں۔ مچھلی کا سالن، لیس دار سفید چاول، چاولوں پر ڈالنے کے لیے پسا ہوا گڑ، مکھن اور شہد اور چاول کی بنی روٹیاں۔ ان کے بن جانے تک بیرل بھی مہندی اتار کر نئی دھاری دار لنگر کھے کی دھوتی، سفید کھلا کھلا پہران پہنے تیار ہوگیا ہے۔ پہران کے گریبان پر سفید ریشم سے پھول پتیوں کی باریک بیل بنی ہوئی ہے جو اس کی بیوی نے پورے دو ماہ لگا کر سوئی دھاگے سے کڑھائی کر کے بنائی ہے۔

زوال کے قریب مہمان بھی پہنچ گئے۔ شہر سے گاؤں تک پنھوں تانگے والا چھوڑ گیا۔ مل ملا کر حالی احوالی ہوئے۔ برآمدے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بیرل اور اس کا سسر ایک ہی چارپائی پر بیٹھے۔ بیوی نے ان کے آگے مچھلی کا سالن، چاولوں کا تھال، پیالہ بھرا پسا ہوا گڑ اور پنڈی میں مکھن سے تربتر چاولوں کی روٹی لا کر رکھی۔ کھانا شروع ہوگیا۔ کھانے والے بڑے بڑے لقمے نگلتے رہے۔ توجہ معیار سے زیادہ مقدار پر تھی۔ ساتھ ساتھ بیرل اور اس کے سسر کی باتیں چلتی رہیں۔ سلیمت کی ماں اور بہن دوسری طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگیں۔ سلیمت اور سکینہ دونوں طرف خالی تھال اور پنڈی بھرتی رہیں۔ بیرل اور اس کے سسر دونوں نے پلیٹ مچھلی، مکھن کے ایک ایک پیڑے کے علاوہ چاولوں کے دو تھال اور لاتعداد روٹیاں کھا کر ختم کیں اور وہیں چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ ان کی باتیں غنودگی کے رنگ میں ڈھلنے لگیں اور کچھ ہی دیر وہ اندر پڑے سو گئے۔ سلیمت نے کھانا کھایا، برتن سمیٹے اور ماں

پنڈی: چنگیر، کھجوری پتوں سے بنی پلیٹ نما جس میں روٹی رکھی جاتی ہے۔

بہن کو لے کر کمرے میں جا بیٹھی۔ کچی اینٹ اور گارے سے بنا لپائی کیا ہوا کمرہ اندر سے ٹھنڈا تھا۔ کھلے دروازے پر رلی ٹنگی تھی جو تاریکی کی وجہ بن رہی تھی۔ ماں چارپائی پر لیٹ گئی۔ سلیمت نے پاؤں دبانا شروع کیے۔ ماں کے خراٹے پیرل اور اس کے سسر کے خراٹوں کے ساتھ ہم آواز ہو گئے۔ ماں کے سونے کے بعد دونوں بہنیں ساتھ لیٹ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔

''مڑس اچھا لگتا ہے بھلا؟''

''یہ کوئی بات ہے بھلا! کبھی مڑس برا لگتا ہے کیا؟'' سلیمت نے الٹا سوال کر دیا۔

''اَئی! ایسے نہیں۔ میں ویسے پوچھ رہی تھی اندھی۔ کیسا لگتا ہے؟''

''مڑس ہے، سر کا سائیں ہے۔ سب کچھ وہی تو ہے۔''

''پر سر تو سفید لگا پڑا ہے، جبھی تو مہندی کرتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ مرد کی عمر ہوتی ہے کیا؟''

''ہاں، یہ تو سچی بات ہے۔ بھلا سنا، ہلت چلت کا کیسا ہے؟''

''اَئی! بڑی ادی، کیا بتاؤں! اتنا اچھا ہے، اتنا اچھا کہ کیا بتاؤں۔ کپڑے لتے، کھانا پینا، کوئی کمی نہیں کرتا۔ اور ہاں، ایک بات بتاتی ہوں، تُو مانے گی ہی نہیں۔''

''کیا؟''

''اس نے آج تک مجھ پر لاٹھی کیا، ہاتھ بھی نہیں اٹھایا۔''

''چل جھوٹی کسی جگہ کی! مرد اور ہاتھ نہ اٹھائے! یہ جھوٹ جا کر کسی اور سے بول۔''

''نہ بڑی ادی، قسم دستگیر کا، مجھے ڈانٹتا بھی نہیں۔''

''سچی؟'' بہن کا ہاتھ حیرت میں منہ پر جم گیا۔

''ایسا اچھا ہے، ایسا اچھا ہے جو بس ہنستا رہتا ہے۔'' سلیمت کے لہجے میں گدگدی بھری ہوئی تھی۔

''قسم اٹھا سرخ قرآن کا!'' بہن سلیمت کو جھنجھوڑ بیٹھی۔

''قسم سرخ پاک قرآن کا۔ جب شہر جاتا ہے نا، تو میرے لیے پتا نہیں کیا کیا لاتا ہے۔ کبھی جلیبی، کبھی مٹھائی، کبھی ماوا، کبھی ریوڑی، کبھی نبات۔ کیا بتاؤں۔ ایسی ایسی چیزیں لاتا ہے!''

''ائی، کیسی قسمت والی ہے! ہم تو بس موچڑوں میں۔''

''میں تو شکر کرتی ہوں میری جان چھوٹی۔''

"ہاں بچی۔ تُو تو اپنے مڑس کے پاؤں دھو کر پی۔ ایسا مڑس تو میں نے کبھی سنا ہی نہیں۔ میرا مرحیات مڑس، اللہ اسے جنت میں جائے دے، ایسا تھا جو لاٹھی باندھا اٹھاتا تو اصل رکھتا ہی نہیں تھا۔''

''دعا دے اس سانپ کو جس نے اسے ڈنک مارا۔ تیری جان تو چھوٹی۔''

''ائی ایسے نہ کہہ! جیسا تھا، میرے سر کا سائیں تھا۔ مارتا تھا تو اس میں اُس کا کیا قصور؟ بس جو لکھے کا نصیب۔ چل، میں سوتی ہوں۔ اتنے دور سے آئے ہیں، لاری نے صفا تھکا دیا ہے۔''

''پاؤں دباؤں کیا تیرے؟''

''نہ ڑی! اتنی بوڑھی نہیں میں۔ تُو گھر کا دیکھ جا کر۔''

وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

ادھر پیرل نیند سے اٹھا تو اس کا سسر چارپائی پر بیٹھا پن والی بیڑی مونھ میں دبائے پیے جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ زور سے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا۔ پیرل نے اٹھتے ہی تیاری کی۔ وہ اپنی دکان کی طرف جانے لگا۔

''ابا کہاں؟'' سسر نے بلغمی آواز میں پوچھا۔

''چاچا، ایسے مڑئی کام وام دیکھ لوں۔ ابھی آتا ہوں۔''

''ابا، پھر مجھے زائفاؤں کے ساتھ کیوں چھوڑے جا رہے ہو؟ ٹھیر جا، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ ٹرک کے پرانے ٹائرز کے ربر کو کاٹ کر بنائی گئی جوتی پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چاچا، میں ابھی آ جاؤں گا۔ تُو یہاں بیٹھ۔ وہاں کیا کرے گا؟''

''نہ ابا، مرد کا کیا کام گھر میں؟ وہڑے وا۔ باہر کوئی دیکھ ریکھ ہو جائے گی۔''

چاچا پیرل کے ساتھ گلی میں باہر آیا۔ وہ گاؤں سے باہر نکلتی گلی میں چلنے لگے۔ گلی کافی کشادہ تھی، اتنی کہ اس میں سے بیل گاڑی یا گدھا گاڑی آرام سے گزر جاتی تھی۔ پیرل کا دراز قد سسر ایک ٹانگ سے ذرا لنگڑاتا، دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، سست رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کے سر کے بال، دو

موچڑے: تھپڑ　　مرحیات: مرحوم۔　　زائفائیں: عورتیں۔

انگل داڑھی، مونچھیں اور گہری بھنویں، سب کی سب مہندی سے رنگی بالکل سرخ رنگت کی تھیں۔ گلی میں آتا جاتا ہر ایک ماما کو دیکھ کر شوخ ہو کر سلام مارتا جاتا، لیکن وہ ماما پیرل جس کا معمول ہر ایک سے مذاق مسخری کا راستہ تھا، آج خاموش خاموش سلام کا جواب دے کر جیسے گزرنے والے کو پرایا لگ رہا تھا۔ پیرل کے اندر فکر کی مشین چل رہی تھی۔ اس کے سسر کو دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ ان کی قوم قبیلے کے رواج میں بہن بیٹی کے گھر شادی کے بعد جانا بے غیرتی تھی۔ یہ تصور ہی نہ تھا کہ کوئی اپنے بیٹی کی ڈیوڑھی بھی پار کرے، چہ جائیکہ روٹی پانی کرنا۔ اسی وجہ سے پیرل نے سسر کو گھر ٹکے رہنے پر زور دیا تھا۔ پر بوڑھے آدمی کو کون سمجھائے؟ اس وقت تو شہر گیا واپس ہوتا تھا اور کام والا بھی کھانا وانا کر کے برگد کے نیچے آ بیٹھتا۔ اب یہ سب کیا ہوگا؟ پورے گوٹھ کو اس بات کی خبر بھی ہو گئی ہو گی۔ لوگ پتا نہیں کیا کیا کہیں گے۔ اور اب یہ ساتھ چلا آیا ہے چاچا۔ سنتا بھی نہیں۔

برگد کے قریب آئے تو اچھے خاصے لوگ چبوترے کو ٹھکانہ بنائے ہوئے تھے۔ چاچا علی حیدر کو دیکھ کر پیرل کو بُرا لگا، جیسے چاول کھاتے منھ میں کنکر آ جائے۔ اس نے اٹ پٹے پن سے سب کو واحد سلام کیا اور اپنے چھپر کی طرف چلا گیا۔ تختے پر اوزار اور دو سوکی کلہاڑی اسی جگہ پڑے تھے جہاں وہ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے دستہ بنانے کے لیے لکڑی چھیلنا شروع کی۔ پیرل کا یہ رویہ سسر کے لیے عجب تھا۔ اسے پیرل کی غیریت نے اچنبھے میں ڈالا۔ وہ سر موڑ کر اسے چھپر میں جاتے دیکھتا رہا۔ نہ کسی سے میل کروایا نہ واقفیت، یہ کوئی طریقہ ہے؟ ایسا ہوتا ہے مائٹی میں؟

چبوترے پر بیٹھے لوگ بھی ماما کی دوری سے حیرت زدہ ہوئے۔ ماما کا معمول ایک ایک کو سلاوالیکم کرنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ وہاں بیٹھے ہوؤں کو ٹہوکے دیتا جملے کستا جاتا۔ لوگ بھی ماما کو تاکے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ آیا ہوا مہمان کچھ کے لیے نئی صورت تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا چبوترے کے قریب ہوا تو چاچا علی حیدر گوٹھ میں نئی صورت آتی دیکھ کر آدر بھاؤ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں بیٹھے ہوؤں میں سب سے بڑی عمر والا ہونے کی وجہ سے اس نے یہ اپنی ذمے داری سمجھی۔

”ادا، بھلی کرے آیا۔ خش؟ چنگو بھلو؟ سب خیر؟ کون مُوس ہو، اَدا؟“

چاچا علی حیدر اٹھ کر نووارد سے ملنے لگا۔ وہ برگد کو ٹیک لگائے، گاؤں کو پیٹھ دیے بیٹھا تھا اس لیے

مائٹی: رشتے داری۔ آدر بھاؤ: استقبال۔ بھلی کرے آیا: خوش آمدید۔

اس نے اسے پیرل کے ساتھ آتے نہیں دیکھا تھا۔

''ادا، میں... ہوں، قادر بخو (قادر بخش)۔'' اس نے نام سے پہلے قوم بتائی۔

اتنی دیر میں دوسرے بھی اٹھ اٹھ کر اس سے ملنے لگے۔ پیرل اپنے کام میں لگ گیا تھا مگر اس کی پوری توجہ برگد کے نیچے تھی۔

''آؤ ادا، آؤ۔ بیٹھو۔'' چاچا علی حیدر نے قادر بخش کو ہاتھ سے پکڑ کر ساتھ بٹھایا۔ ''کوئی لسی پانی ہو جائے ادا؟''

''نہ ادا، نہ! اصفا طلب ہی نہیں۔''

''وری بھی ادا، آئے ہو، کچھ تو پیو۔''

''نہ ادا، نہ!''

''ہاں تو ادا، دے حال احوال؟ خیر خبر؟ کیسے آنکلے ہو؟ کس میں کام وام ہے؟''

''نہ ادا، کام وام کیسا؟ یہ اپنا پیرل نہیں ہے؟ اس کے پاس آیا ہوا ہوں۔'' قادر بخش جملہ پورا کر کے کھانسنے لگا۔

''ہاں؟ اڑے پیرل، اتنا بھی نہیں سیکھا؟ آئے گئے کو ملایا جاتا ہے، کوئی واقفیت، کوئی عزت۔ ابھی تک تو نہیں سدھرا؟'' چاچا علی حیدر پیرل پر گرم ہو کر بولا۔

''چاچا، یہ ماما پیرل کا سسر ہے۔ اس کے گھر آیا ہے،'' ساتھ بیٹھے نے سرگوشی کرتے چاچا علی حیدر کو آگاہی دی۔

''ہاں؟ یہ وری کیا کہا تو نے؟ پیرل کا سسر؟ بیٹی کے گھر آیا ہے؟'' چاچے علی حیدر نے سرگوشی کرنے والے کو گھور کر دیکھا اور پے در پے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ہر سوال کے جواب میں بولنے کی جگہ تائیداً سر ہلایا گیا۔

''اڑے یہ کیا کہہ رہا ہے بشو (بشیر)؟'' چاچے نے وہاں اور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بے یقینی کے عالم میں تصدیق چاہی۔

''ہاؤ چاچا، ہاؤ!'' گدھے گاڑی والے شیر محمد عرف شیرل نے واضح الفاظ میں بتایا۔

وری: پھر۔

"بے گیرتی (بے غیرتی) کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!" چاچے علی حیدر کی بات ماحول میں کڑکی۔
"یہ تو ہے باہر والا، اسے کیا کہیں۔ تو پیرو ٹیرو، یہ تو نے مائی کہاں کی ہے بے گیرت؟ ہم بکری بھینس بھی دیکھ کر لیتے ہیں۔ یہ تو نے کیا کیا ہے اندھی کے بچے؟ لخ لعنت ہو تجھ پر!"

چاچا علی حیدر غیظ و غضب کی حالت میں پیرل کے تختے کے پاس چلا گیا۔ پیرل کے پاس بولنے کو کچھ نہ تھا، اور اگر ہوتا تب بھی چاچے علی حیدر کے آگے زبان کھولنا ممکن نہ تھا۔ دبلا پتلا چاچا علی حیدر انتہائی گرم طبیعت اور بات بات پر آپے سے باہر ہونے والے مزاج کا مالک تھا۔ ہر چیز میں الجھنا اور ہر ایک کی پگڑی اتارنا اس کا معمول تھا۔

"چاچا چھوڑ! مہمان ہے، کچھ خیال کر۔"

دو تین چاچے کو چپ کروانے اٹھ آئے۔

"کاہے کا ڑے مہمان؟ نہ گیرت نہ شرم!"

"چاچا چھوڑ اب۔ کیا کر رہا ہے؟" کسی نے چاچے کو کھینچ کر لے جانا چاہا۔

"اڑے چھوڑ مجھے! مجھے کہہ رہا ہے؟ اس بے گیرت کو کچھ نہیں کہتا جو بیٹی کے گھر آیا ہے!" چاچے نے اس بار قادر بخش کو نشانہ بنایا جو چبوترے سے اٹھ کر آیا تھا۔

"تُو ڑے، بول کیا رہا ہے بڈھے؟ ہوش میں ہے یا نہیں؟" قادر بخش چاچے علی حیدر پر جھپٹا۔

"چاچا، چھوڑ تُو اس کو۔ یہ ادھ مغزی ہے۔"

پیرل نے، جو تختے پر سر جھکائے کام میں لگا تھا، تیر کی طرح سسر کے پاس پہنچ کر اسے روکا۔

"ادھ مغزی ہے تو اپنے گھر ہوگا۔ کتے کی طرح بھونکتا ہے یہ!"

"چاچا چل، گھر چلتے ہیں۔" پیرل سسر کو لے جانے لگا۔

"ہاں ہاں، لے جا گھر بے گیرت! اولاد بھی ایسی بدنسلی پیدا ہوگی نا!" چاچا علی حیدر اپنے پکڑنے والوں سے چھڑانے کی کوشش کرتا پھنکارا۔

"اس کنجر کو تو میں دیکھتا ہوں!" پیرل کا دراز قد سسر لنگڑاتا ہوا پھر علی حیدر کی طرف دوڑا۔

"چاچا بلی، چھوڑ دے اسے۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"اڑے پیرل! تُو اس بڈھے کا منہ بند نہیں کرتا اور مجھے روک رہا ہے؟" سسر پیرل پر چلایا۔

''چاچاباپ کی عمر کا ہے، اس کے اوپر آدمی نہ ہاتھ اٹھا سکے نہ گردن۔''

بیرل سسر کو کھینچتا گوٹھ کی طرف اوپر لے جارہا تھا۔

''چاچاماف کرنا، ایسا چریا ہے چاچا علی حیدر۔ تم ایسا ویسامت سمجھنا۔'' ایک دو گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے آکر بیرل کے سسر کے آگے ہاتھ جوڑنے لگے۔

''چریا ہے تو باندھ دو نا اسے۔ کھلا کیوں چھوڑا ہے؟'' قادر بخش کا غصہ کم نہ ہوا۔

''چاچا، یہ ہمارے ہاتھ دیکھ۔ تُو بھی بڑا ہے، وہ بھی بڑا ہے، ہم کریں کیا!'' کسی نے قادر بخش کی ٹھوڑی کو چھوا تو کسی نے گھٹنے کو ہاتھ لگا کر قادر بخش کو رام کرنے کی کوشش کی۔

اُدھر برگد کے نیچے چاچا علی حیدر ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔

''ہمارے بال سفید ہو گئے، پر ایسی بے حیائی! ایسی لوسپائی کہ بیٹی کے گھر آ بیٹھا ہے! بیٹی کے گھر؟ اس سے پہلے یہ لنگڑا ڈوب کے نہیں مرا؟''

''چاچا اب بس کر، اپنا اپنا رواج ہوتا ہے۔ ان کے ہاں آتے جاتے ہوں گے،'' کسی نے چاچے کی بات کاٹ کر کہا۔

''یہ بے غیرتی ہے یا رواج؟ ایسا رواج ہوتا ہے؟ اسی لیے تو کہتے ہیں، اپنوں سے باہر نہ جاؤ۔ اپنے کا عیب صواب معلوم ہوتا۔ اس بیروٹیرو کو ملا کیا باہر جا کر؟ کون سی پگڑیاں بندھ گئیں؟ سارا زمانہ تھوتھو کرے گا کہ حرامی نے کس جگہ سے رشتہ جوڑا ہے۔ باپ دادا کی واہوا عزت کروائی اس نے۔''

''چاچا، کھلے میں بیٹھے ہیں، چھت کے نیچے نہیں۔ اب بس کر جا۔ اپنا پرایا آجا رہا ہے۔ چھوڑ۔''

مگر چاچے علی حیدر نے کیا سننا تھا۔ وہ اسی رفتار تھوکیں اڑاتا رہا۔ اِدھر گلی میں گاؤں کے چند لوگ قادر بخش کے پیچھے چلتے بیرل کے گھر تک آئے۔ وہ اس کے سامنے چاچا علی حیدر کی باتوں کی تعبیر اس کی بڑی عمر، بے وقوفی، غصے سے جوڑ کر بات کا اثر کم کرنے میں لگے رہے جس کا اندازہ نہیں ہو پایا کہ کس قدر وہ پُراثر رہیں۔ قادر بخش کسی سے بات کیے بنا تیز تیز لنگڑاتا بیرل کے گھر اندر داخل ہو گیا۔ ماما بیرل نے دروازے پر آئے ہوؤں کو مجروح نظروں سے دیکھا اور سسر کے پیچھے اندر چلا گیا۔

''اٹھ بڑھیا، سامان سنبھال!'' قادر بخش گھر میں گھستے ہی بیوی کے اوپر گرجنے لگا۔ وہ جو بیٹی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی، اس کے تیور دیکھ کر خوف کھا گئی۔

''ہوا کیا؟'' اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوا کیا؟ تُو آگے سے پوچھتی ہے کمینی؟ بند کر منھ! اٹھ، ابھی کے ابھی سامان باندھ۔''

قادر بخش کی بات کے بعد اس نے داماد کی طرف دیکھا تک نہیں، اٹھ کر سامان کو گٹھڑی میں باندھنے لگی۔

''دیکھ چاچا، ایسے نہ کر۔ رب کا واسطہ ہے۔ ایسے ناراض ہو کر جاؤ گے تو کیا عزت رہے گی میری؟''

''باہر بڑی عزت کروائی نا تم نے! اور کوئی کسر رہ گئی ہے تو ارمان پورے کر لے۔''

''ابا، ایسے نہ کرو۔ کیوں ناراض ہو کر جا رہے ہو؟'' پیرل کی بیوی باپ کی طرف دوڑی۔

''دور ہو کُتی رن! تیری وجہ سے ساری خواری ہوئی ہے۔ جلدی کر بڑھیا!''

''ابا، تجھے دستگیر کا واسطہ ہے، یہ میں اپنا دوپٹا تیرے پاؤں میں ڈالتی ہوں، ایسے نہ جا۔''

سلیمت کے لیے معاملہ ابھی الجھا تھا کہ بات کیا ہے، لیکن یہ بات تو واضح تھی کہ اس کا باپ کسی بات پر غصے ہو کر گھر سے جا رہا تھا۔

''چاچا، یہ میرے ہاتھوں کو دیکھ، میں تیرے آگے جوڑتا ہوں، ایسے نہ کر!'' پیرل سسر کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔ اتنی دیر میں قادر بخش کی بیوی سامان لتوں کی پوٹلی باندھ کر شوہر کے حکم کا انتظار کرنے لگی۔

''دے اِدھر!'' کہہ کر قادر بخش نے بیوی کے ہاتھ سے پوٹلی چھینی اور گھر سے باہر چلنے لگا۔ اس کی بیوی اور بیٹی سر جھکائے اس کے پیچھے چلیں۔

''ابا، تجھے سرخ قرآن کا واسطہ ہے، نہ جا!''

''اگر تُو میری بیٹی ہے تو ابھی کے ابھی میرے ساتھ چل! پھر زندگی بھر کبھی اس گھر میں پاؤں نہ رکھنا۔ چل میرے ساتھ!'' قادر بخش چند قدم آگے جا کر کھڑا ہو کر بیٹی سے بولا۔

''چاچا، ایسے نہ کرو۔ کاوڑ تھوک دو۔ سورج اترنے والا ہے، اس وقت کہاں جاؤ گے؟'' پیرل نے پھر سسر کو رام کرنے کے لیے زور لگایا۔

کاوڑ: غصہ۔

''جدھر بھی جائیں، تیرا کیا؟ تُو بتا، چلے گی یا نہیں؟'' قادر بخش بیٹی سے سوال کرتے ہوئے غرّایا۔ سلیمت جواب دینے کے بجائے اس کے لہجے میں بھرے غصے سے ڈر گئی۔ اس سے بولا نہ گیا۔

''معنی تو نہیں چلے گی حرامزادی! آج کے بعد تو ہمارے لیے مر گئی۔ کبھی ہماری طرف منہ نہ کرنا، بھلے مرتی مر جائے۔ تُو کیوں بندھی کھڑی ہے بڑھیا؟''

قادر بخش نے بیوی کو دھکیلا۔ سلیمت نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اپنی ماں، بہن اور باپ کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ وہیں کھڑا پیرل مخمصے میں آ گیا کہ سسر کے پیچھے جائے یا بیوی کو سنبھالے۔

شام ہو رہی تھی۔ گلی میں سے گھروں کو لوٹتی بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پیرل برآمدے میں پڑی چارپائی پر لیٹا تھا۔ بیوی اندر کمرے میں تھی جہاں جانے کا ابھی پیرل کا من نہ تھا۔ ماں کو کمرے سے نہ نکلتے دیکھ کر سکینہ کھانا پکانے میں لگ گئی۔ مغرب کی اذانوں کی دیر بعد سکینہ نے چاولوں سے بھرا تسلہ اور پسے ہوئے گڑ کا پیالہ باپ کے آگے رکھا۔ پیرل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیوی کو پانی لانے کے لیے آواز دی مگر جواب نہ سن کر اس نے چاولوں پر گُڑ بُرکتے ہوئے کھانا شروع کر دیا۔ بھرا تسلہ خالی کر کے اس نے ڈکار ماری اور پھر سستی سے وہیں لیٹ گیا۔ پیرل کے اندر اب بھی برگد کے نیچے والا واقعہ پھر رہا تھا۔ جو کچھ وہاں پیش آیا وہ اسے زیادہ غلط نہیں لگ رہا تھا۔ اسے چاچے علی حیدر کا بولنا چبھ تو رہا تھا مگر ایسا بھی لگ رہا تھا جیسے اس کی طرف سے بھی چاچے علی حیدر نے دو بول بول دیے ہوں۔ اس نے پیٹ پر زور پڑتا محسوس کیا۔ اس نے کروٹ بدلی اور پہلو کے بل ہو کر زوردار آواز میں ایک پاد داغا۔ ''ہائے ہائے'' کہہ کر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اب فرحت ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیوی کو منانے کمرے اندر چل دیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو بیوی ابھی بھی سسک رہی تھی۔ اس کی سسکیاں سن کر اس پر بوجھ پڑ گیا۔ یہ آواز اسے مارے ڈالنے لگی۔ وہ اسے منانے میں جت گیا۔ پھر جب پاؤں کی تلیوں میں گدگدی کرنے، پاد چھوڑنے، مسخری کرنے پر بھی بیوی نہ مانی تو وہ زمین پر بیٹھ کر کان پکڑتے مرغا بنتے ''ککڑوں کوں'' کی آواز بولنے لگا۔

''اللہ سائیں مانی! یہ کیا قہر کر رہے ہو سائیں؟ لوگ سنیں گے تو کیا بولیں گے!''

بیوی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا منھ دبایا۔

''کہیں گے مرغا بول رہا ہے، اور کیا!''

''سب کو پتا ہے، ہمارے پاس مرغا ہے ہی نہیں۔''

''یہ تمھارے سامنے اتنا بڑا بیٹھا ہوا ہے، نظر نہیں آتا؟ ایک بار پھر بولوں؟ ککڑوں کوں!''

''بس کرو سائیں۔ توبہ ہے میری۔ اوپر بیٹھو۔''

بیوی نے کھینچ کر اٹھایا۔ پیرل اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بیوی کو بازوؤں میں لے کر اس کا گال چوما۔ بیوی کی غمزدگی میں کمی آئی۔ وہ شرما کر ہنس دی۔

''اس طرح ہنسا کرو۔ تُو دکھی ہوتی ہے تو میرا سورج ڈوب جاتا ہے۔ سکینہ، چاول لے کر آ۔'' اس نے سکینہ کو پکارا۔ ''آج میں تمھیں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں۔''

بیوی پھر ہنس دی۔ اس کا غم کم ہوا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ سکھ پا سکے۔ اس نے پیرل سے شام والی بات پوچھی۔ پیرل اس کے کہنے پر واقعہ بتاتا گیا اور اس دوران جہاں تک ممکن تھا، وہ چاچا علی حیدر کی باتیں کم کرتا گیا۔ یہ سنتے سنتے بیوی کے غم پر غصہ حاوی ہونے لگا۔ وہ علی حیدر کو گالیاں اور کوسنے دینے لگی۔

''کالا منھ ہو اس بڈھے کا! رب کرے اسے کفن بھی نہ ملے! دستگیر کرے ڈوب کے مر جائے، اندھا ہو جائے، اس کی ٹانگ ٹوٹے مردار کی! جنازہ قبر بھی نہ ملے کسی کو اس کی! اللہ سائیں اسے کالا سانپ کاٹ جائے! کوڑھ ہو جائے اس کو!'' وہ جھولی بھر بھر کے بددعائیں کرنے لگی۔

''اب چھوڑ۔ بڑا ہے، سفید داڑھی والا۔''

''تیرا ہوگا بڑا۔ ایسے ہی چھوڑ دوں اسے؟ اس بدبخت نے میرے اپنے چھین لیے مجھ سے۔ یہ میری جھولی دیکھ رہا ہے نا مولا؟ اس سے میرا ایک ایک حساب لینا۔''

''اب اٹھ۔ روٹی ووٹی کھا لے۔'' پیرل نے بیوی کو نیچے سے زبردستی اٹھایا جو جھولی پھیلا کر گڑگڑاتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ بیوی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''فکرات نہ کر دلڑی۔ ہم چلیں گے، تیرے باپ والوں کو منا کر آئیں گے۔ میں نہیں ہوں؟'' اس بات سے سلیمت کی دل پر ٹھنڈے چھینٹے پڑے۔

''اب تو خوش؟'' سلیمت نے سر ہلایا۔ ''بھلا ہنس کر دکھا!'' پیرل کے الفاظ میں چاہت کا جادو تھا۔ بیوی مسکرائی۔ پیرل کا من کھل اٹھا۔ اٹ پٹے واقعات سے پیدا ہونے والی مشکل صورتحال کا اختتام پیرل کی طبیعت میں وہی جولانی لانے لگا۔ اس نے بیوی کو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل پڑنے تک نہیں چھوڑا۔ بعدازاں دونوں لیٹ پیٹ کر سو گئے۔

پیرل حسب عادت پو پھٹنے کے وقت جاگا تو آسمان سیاہ بھرے بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ روز چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا نام نہ تھا جو صبح کو اور بامعنی بناتے تھے۔ ماحول میں بھاری پن تھا اور حبس کی اولین کیفیت چھائی تھی۔ مطلب کہ بارش کی جملہ نشانیاں موجود تھیں۔ یہ اشارے دیکھ کر پیرل کا جی خوش ہو گیا۔ لوٹا اٹھائے وقت اس نے پاد داغا۔ پاخانے سے نکلتے وقت ''ہائے ہائے'' کی آواز ایک خوش آہنگی کے ساتھ اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ ''اتنا تو کھا کر مزہ نہیں آتا جتنا ہگ کر آتا ہے،'' اس نے خود کلامی کی۔ ''واہ مولا واہ! خوش رہ سدا۔ بس آج ایسا کوئی مینھ برسا، دل میں ٹھنڈ پڑ جائے۔ بوند گرے کوئی وقت ہو گیا ہے۔ جو انڈے تھے وہ بچوں والے ہو گئے ہوں گے۔ ابھی اور کتنا ترسائے گا؟ کوئی ہے حساب کتاب تو بول۔ ہے کوئی؟ مسیت (مسجد) ہے، ملّا ہے۔ ملّا کو ان پانی ملتا ہے۔ ملّا آذان نماز سب کر رہا ہے، تو پھر اور کیا بات ہے؟ اگر کوئی اور ناراضگی ہے تو بتا دے بھلا۔ بنا بتائے ناراضگی کا کوئی فائدہ؟ یار، بات سن! اگر کوئی ایسی ویسی چھوٹی موٹی ناراضگی ہے تو معاف کر کے اپنا قرب کر۔ مینھ پڑے گا ناں تو چھوٹا بڑا بہت خوش ہو گا۔ دعا کریں گے تجھے۔ مولا نہیں ہے؟ بس پھر آج دما دم مست قلندر ہو جائے۔ چل بھلا، یہ بھی وعدہ ہے، آج مینھ برسا تو اس جمعے نماز پڑھوں گا۔ پکا وعدہ ہے داڑھی کا!'' پیرل نے سیدھا ہاتھ داڑھی پر پھیرا۔ ''ایسے نہیں کہہ رہا، پکا پڑھوں گا۔ وہ پچھلی بار اونچ نیچ ہو گئی تھی لیکن اب بالکل ایسا نہ ہو گا۔'' پیرل نیم روشنی میں کھڑا آسمان کی طرف منہ کیے بولے جا رہا تھا۔ ''پھر کیا کہتا ہے؟ ہو گا کام یا نہیں؟ ہو گا نا؟ وَہوا سائیں، وَہوا! آج میں ہٹی پر ہی نہیں جاتا۔ یا جاؤں؟ اگر مینھ میں تھوڑی دیر کر دے تو میں سامان لے آؤں؟ ایسے بچوں کی شے شغل ہو جائے گی۔ بچے خوش۔ ٹھیک ہے؟ اچھا پھر میں جاتا ہوں۔ ابھی جاتا ہوں اور جود میں سامان سڑولے کر واپس آجاؤں گا۔ سائیکل ایسے بھگاؤں گا جو ریل کار، دیکھنا تم! کیوں، یقین نہیں آیا کیا؟ اب ایسی بات بھی

جود: جلدی۔

نہیں۔ صفا گیا گزرا نہ سمجھ۔ دیکھنا کیسے اڑاتا ہوں۔"

پیرل نے بولتے بولتے سائیکل اٹھائی اور تیز تیز پیڈل مارتا گلی سے نیچے اترتے راستے پر جانے لگا۔ اترائی پر آکر اس نے زور لگا کر دو پیڈل مارے۔ سائیکل کی رفتار تیز گھوڑے جیسی ہوگئی۔ ٹیلے سے اتر کر برگد کے بازو سے ہو کر شہر جاتی کچی سڑک پر چڑھتے اس نے پیڈل گھمانا روک دیا۔ سائیکل کے پہیوں نے جو رفتار پکڑی تھی وہ اسی دھن میں بھاگے جا رہے تھے۔ دو رویہ درختوں کے بیچ سڑک بالکل خالی تھی۔ پیرل پیڈل روکے، سائیکل کی گدی پر بیٹھا تھا۔ سائیکل دوڑ رہی تھی۔ اسی اثنا میں "کووُو!" کی آواز گونجی۔ درخت کی شاخوں میں چھپی بیٹھی کوئل بولی تھی۔ پیرل آواز سن کر ترنگ میں آ گیا۔ اس نے اسی انداز میں کوئل کی طرح جوابی "کووُو!" کی آواز نکالی۔ کوئل آواز سن کر مغالطے میں آئی اور اس نے شدت سے "کووُو!" کی کوک کی۔ پیرل لہک لہک کر پیڈل مارتا "کووُو" بولتا گیا۔ ان دونوں کی کوک کی آواز تب تک آپس میں ٹکراتی گئی جب تک پیرل کی سائیکل دور پرے نہیں پہنچ گئی۔

پیرل شہر میں داخل ہوا تو بادلوں کے باوجود روشنی پھیل چکی تھی مگر شہر اب بھی شب بسری کی سنسانی میں تھا۔ پیرل سائیکل چلاتا عاشق دکاندار کے گھر کے سامنے جا اترا۔ اترتے ہی وہ دروازے پر لگی زنجیری کنڈی کھٹکھٹانے لگا، تیز اور بلا وقفہ۔ دکاندار عاشق ہڑبڑا کر اٹھا اور لپک جھپک کر دروازے کے کواڑ کھول کر باہر نکلا۔ وہ ابھی تک دھوتی کے پلّو اُڑسے جا رہا تھا۔

"ادا پیرل، کر خبر، سب خیر تو ہے؟"

"ہاؤ یار، سب خیر ہے۔ بھلا خیر نہ ہوتا تو میرے تیرے پاس کیوں آتا؟"

"پر اتنی صبح صبح؟ ابھی ہم نے لسی پانی بھی نہیں کیا۔ کوئی پیسے ڈوکڑ چاہییں؟"

"اڑے یار، میں پیسے ڈوکڑ کیا کروں گا؟ چل دکان کھول، سامان لینا ہے۔"

"یار پیرل، صفا حد کر دی! یہ کوئی وخت (وقت) ہے سامان لینے کا؟"

"یار، میلہ بھرا کھڑا ہے، دیکھ نہیں رہے؟ جلد سامان دے تو میں جاؤں۔"

"یار پیرل، صفا زور آور مڑس ہو یار۔" عاشق دکاندار مڑا اور گھر اندر جانے لگا۔

"اڑے اُدھر کدھر؟ چل دکان کھول!" پیرل نے اسے بازو سے پکڑا۔

"یار، کوئی گنجی قمیص پہن تو لوں۔"

''اڑے زائقاں ہے کیا جو گنجی قمیص پہنے گا؟ جلدی کر!''

''یار... یار، بس کیا کہوں تجھے! چل بھلا۔''

عاشق نے دھوتی کے پلّو میں بندھا چابیوں کا گچھا ہاتھ میں پکڑا اور ساتھ موجود دکان کے دروازے کے وزنی قفل میں دندانے دار چابی گھما کر دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ اس پٹ کی چوڑائی دکان کے آدھے حصے برابر تھی۔ تین طرف دیوار سے بند دکان کے اندھیرے کو اس نے موم بتی جلا کر دور کیا۔ پیرل نے جھٹ پٹ مطلوبہ سامان اور بیوی کے لیے پراندلیا اور سائیکل پر بندھے ڈولوں میں بند کر کے واپسی کا راستہ لیا۔

''پیسے حساب میں لکھ لینا اور جلد گھر جا کر بیوی کو تسلی دے جو پریشان ہوگی یہ نہا گا اس وقت کہاں گیا۔''

''اڑے چل اب! تُو جا کر اپنی بیوی کو تسلی دے۔ نئی ہے نا تیری!''

''ہاہاہا! جاتا ہوں، جاتا ہوں۔'' پیرل ہنسا اور پیڈل پر زور مارتے واپسی کے راستے کی طرف جانے لگا۔ اِدھر گاؤں میں بھینسوں کو چارا اور اڈال کر دودھ دوہا جا چکا۔ لڑکے بالے بھینس گائے لے کر جنگل جا چکے۔ نگاہیں آسمان پر ٹکی ہیں۔ امید بھری کیفیت ہر شخص کے اندر جگہ بنا چکی تھی۔ ویسی ہی جیسی ہر جوان دل کا خاصہ ہوتی ہے۔ بادل بھی عین سر پر جم گئے تھے۔ ان کے ہجوم سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ شاید پہلے میں، پہلے میں پر تکرار ہو رہی تھی۔ پیرل محراب دار سڑک پر تھا۔ بند ہوا میں درختوں کی شاخیں آپس میں یوں سر جوڑے کھڑی تھیں جیسے بالی عمر کی لڑکیاں آپس میں گھس پھس کیے جا رہی ہوں۔ پیرل سامان ڈولوں سے نکال کر صندوق میں رکھ رہا تھا تو بوندیں ٹِکن ٹِکن گرنے لگیں۔ پیرل سامان رکھنے میں تھا کہ بادل پھٹ پڑے۔ مینھ کی بڑی بڑی بوندوں نے فضا کو ڈھانپ دیا۔ ایسا اندھیرا جیسے مغرب پڑ گئی ہو۔ مٹی کا سفید رنگ بھورا پڑ گیا، مٹی سے لپی چھتوں کے پرنالے بہنے لگے اور ہر پاسے دریا جیسا مٹیالا پانی کھڑا ہو گیا۔ ٹیلے کی اترائی پر پانی کے ریلے نالیاں بنا کر بہہ نکلے۔ صحن آنگن میں کھڑے پانی میں برستی بارش سے بلبلے بننے لگے۔ بچے مینھ میں باہر نکل آئے۔ وہ کچی گلی جس میں عورتوں کے پاؤں گھسیٹ کر چلنے سے دھول اڑتی تھی، پانی کا تالاب بن چکی۔ بچے اس میں چھپا چھپ پانی کے چھینٹے اڑانے لگے۔ بچوں کا ہجوم دوڑتا اچھلتا چیخ رہا تھا۔ ''اللہ

سائیں مینھ وَسا، گوڈے جیڈی گپ کر!'' وہ سب ایک آواز میں چلّائے جا رہے تھے۔ یہی الفاظ دہراتے وہ بڑی گلی میں دوڑ پڑتے اور ایک کونے سے دوسرے کونے ایک دوجے سے آگے نکلنے کی دھن میں گرتے بھاگتے جاتے۔ کوئی کوئی اپنی جی داری دکھاتا دوڑتا ہوا خود کو پیٹھ بل پانی کی چادر میں گراتا اور پھر کیچڑ میں پھسلتا جاتا۔ پیرل کچھ دیر مینھ کم ہونے کی آس میں رُکا رہا، مگر بوندیں تھیں کہ اور بھاری ہوتی جا رہی تھیں۔ پیرل اللہ کا نام لے کر گاؤں کی طرف چلا۔ اسے بس چڑھائی پر پھسلنے کی فکر تھی۔ وہ جوں ہی برگد کے نیچے سے نکل کر چڑھائی پر دو قدم چلا تو پانی سے بالکل شرابور ہو گیا۔ اس کا سفید پیراہن تر بتر ہو کر اس کے مٹکے ایسے پیٹ کے گرد لپٹ گیا۔ دھوتی کے پلّو وزن دار ہو کر بیل کی گردنی کھال کی طرح لٹکنے لگے۔ چڑھائی پر چڑھتے ہوئے وہ بار بار پھسل رہا تھا۔ وہ کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا۔ مشکلوں سے گلی میں داخل ہوا تو وہاں بچوں کی سلطنت قائم تھی۔ ماما کو مینھ کے ماحول میں کوئی پہچان نہ پایا۔ بچوں کو بس یہی نظر آیا کہ کوئی بڑا قریب آ رہا ہے۔ ان کی مستی میں رخنہ پڑنے لگا۔ ڈانٹ ڈپٹ سے خوف کھا کر کچھ سست دل گھروں کی راہ پکڑنے لگے۔ اسی دوران برستے مینھ میں ہیولے کی آواز آئی:

''ہٹ جاؤ، تمھاری نانی مر جائے!''

آواز کا ابھرنا تھا کہ شور و غوغا نے ایک نئی شکل لے لی۔ بھاگتے بچے ماما کو چمٹ گئے۔

''ماما پیرل، شے دے! ماما پیرل، شے دے!''

ماما بیچارہ شے کہاں سے دیتا۔ وہ بچوں سے اٹکتا، خود کو سنبھالتا کیچڑ میں جا گرا تھا جہاں بچے اس کے اوپر یلغار کیے ہوئے تھے۔

''تمھاری نانی مر جائے، مجھے اٹھنے تو دو!'' مگر ماما کی آواز کسی کو سننے میں نہیں آ رہی تھی۔ ہجوم ماما کے جسم پر امنڈا ہوا تھا۔ ماما اٹھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جا رہا تھا۔

گاؤں کے مغربی جانب درختوں کے سائے میں موجود تالاب کے اندر پانی کی نالیاں اترنے لگیں۔ یہ تالاب جو کل تک بچے کھچے پانی اور کیچڑ کا ملغوبہ تھا، اب پانی سے لبریز ہونے لگا۔ کناروں پر

اللہ سائیں مینھ وَسا، گوڈے جیڈی گپ کر: اللہ سائیں مینھ برسا، گھٹنوں گھٹنوں پانی لا۔

سوکھ کر تڑخی ہوئی مٹی نم ہوکر پانی میں گھلنے لگی۔ آہستہ آہستہ تالاب بھرتا گیا اور کنارے پھیلتے گئے۔ مینھ ختم ہونے تک تالاب میں بھینس ڈباؤ پانی کھڑا ہوگیا۔ لوگ باگ مینھ رکنے کے بعد صحن کمروں سے نکلے اور چھپا چھپ کرتے باہر چلے۔ ہر ایک سنگی ساتھی کو گیا۔ لڑکیاں دیواروں کے اوپر سے سہیلیوں کو پیغام کرنے لگیں۔ بڑے بوڑھے بھی اپنی اونگھ چھوڑ کر چارپائی پر اٹھ بیٹھ گئے۔ انتظار میں تھے کہ پانی کھیتوں میں نکل جائے تو ٹیک لے کر باہر جایا جائے۔ عورتیں بچوں کی فرمائش کے بنا دیگچیاں چڑھائے گڑ کے چاول بنانے بیٹھ گئیں۔ فضا میں سے دھول کا نشان مٹ چکا ہے۔ درخت کی ٹہنیوں پر اُڈاریاں مارتے سبز طوطوں کی ٹیئوں ٹیئوں کوے کی کائیں کائیں پر غالب آچکی ہے۔ جنگل کو چرنے گئی بھینسیں وقت سے پہلے واپس آرہی ہیں۔ اس موسم میں میہار سے شام کا انتظار کرنا ممکن نہیں۔ وہ تالاب کی جانب دوڑ کر پہنچنا چاہتے ہیں جو اَب سانولے اور گندمی جسموں سے بھر گیا ہے۔ بڑے لڑکے جیسے پورے تالاب پر چھائے ہوئے ہیں۔ درختوں پر چڑھ کر قلابازیاں لگانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چھوٹی عمر والے کنارے کنارے چمٹ کر تیرنے کے بجائے نہانے میں مشغول ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں، کچھ بتا کر اور کچھ پوچھے بنا، سہیلیوں کے ہاں جا نکلی ہیں۔ چارپائی کی اوٹ میں گڈے گڈی کا بیاہ رچانے کی باتیں کیے جا رہی ہیں۔ کھی کھی کی آواز سن کر کسی کا چھنکا بھائی بچپن کے تجسس میں آکر جھانکنے کے لیے قریب ہوتا ہے۔ بازو کے بل کھڑی چارپائی کے اوپر سے اس کا ننھا سر نمودار ہوتے ہی کھی کھی چیختی آواز میں بدل جاتی ہے۔ بل ہنگام ہو جاتا ہے۔

اس شور سے دور بیرل اپنی بیوی کے بازو سے جڑا بیٹھا ہے جو گڑ والے میٹھے چاول دیگچی میں چڑھائے بیٹھی ہے۔ سکینہ پاس پڑوس میں اور دونوں بیٹے تالاب پر۔ خالی باورچی خانے میں بیرل کے ہاتھ مستی سے رک ہی نہیں رہے۔ سلیمت کسی کے آنے کے ڈر سے اسے بار بار دور دھکیل رہی ہے۔

''نہ کرو ایسا! کوئی دیکھے تو؟'' بیوی تنگ آچکی ہے۔ اب کے وہ بل کھا کر بولتی ہے۔ اس بار بیرل نے کمر پر چٹکی کاٹی ہے۔

''میں تو کروں گا! بیوی ہے تو میری، اپنے گھر میں ہیں، ایسا دلبر موسم ہے۔ اب بھی ایسے نہ کروں تو کب کروں؟''

''نہ کر! تمھیں تو کچھ ہوتا نہیں، مجھے شرم آرہی ہے۔''

''شرم آرہی ہے؟ کہاں ہے شرم؟ کدھر ہے؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی!'' پیرل بیوی کے دوپٹے کو یہاں وہاں سے اٹھا کر ڈھونڈنے لگتا ہے۔

''مجھے تنگ مت کر، نہیں تو میں جاتی ہوں!'' سلیمت غصہ کھا کر کھڑی ہوگئی۔

''بس، بس، بات ختم۔ اب خوش؟''

پیرل بیوی کا پہلو چھوڑ کر سامنے پیڑھی پر جا بیٹھا اور خوشی بھری آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' بیوی گلنار ہوگئی۔

''دل کرتا ہے تمھیں ساری عمر بیٹھ کر دیکھتا رہوں،'' پیرل پُرشوق انداز میں بولا۔

''بس اب باہر جاؤ۔ مرد کا یہاں کیا کام؟''

''اچھا جاتا ہوں۔''

پیرل اٹھ کھڑا ہوا۔ باورچی خانے سے نکل کر آنگن میں کیچڑ سے بچنے کے لیے رکھے اینٹوں کے قدمچوں پر پاؤں رکھتے جانے لگا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' سلیمت اٹھ کر پیچھے آئی۔

''خود تو کہہ رہی ہے، جاؤ۔ تو جارہا ہوں۔''

''جلدی آجانا۔''

''کہو تو نہ جاؤں؟'' پیرل پھر شوخ ہوگیا۔

''جاؤ جاؤ! میں بس کہہ رہی تھی جلد آنا، چاول پک جائیں گے۔''

سلیمت واپس چولھے پر بیٹھ گئی۔ پیرل نکل گیا۔ وہ بیٹھ کر چاولوں میں چمچ گھمانے لگی۔ اس کے دل پر غبار تھا۔ غمزدگی کسی چادر کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ ماں باپ کا کل یوں جانا اور علی حیدر کا بھونکنا اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ باہر کی ہونے کا تاثر اور گہرا ہوگیا تھا۔ وہ خود کو اس گوٹھ میں غیر جان رہی تھی۔ پہلے ہی عورتوں نے طعنے مار مار کر جینا مشکل کر رکھا تھا۔ سال بھر ہونے کے باوجود خالی کوکھ انھیں بولنے پر اکساتی تھی۔

''مولا سائیں، میری امید پوری کر، ایک سرخ بیٹا دے دے۔ گوٹھ والیوں نے جگر چھلنی کردیا

ہے۔ میں عمر بھر تیرا احسان مانوں گی۔ تیرے پاس کیا کمی ہے۔ رُگوایک بیٹے کا سوال ہے۔ یا پنجتن پاک، میری مدد کر! یا پیر دستگیر، مجھے بیٹا لے کر دے۔ میں ہر گیارھویں کو تیرے نام کا دیگچہ اتاروں گی۔" اپنے دوپٹے کو پھیلائے سلیمت آزی نیازی کرنے لگی۔ اس کا دھیان دیگچی سے ہٹ گیا تھا جس میں پڑے چاول پک کر دیگچی کے پیندے سے لگے جارہے تھے۔

چولھوں پر رکھی دیگچیاں اترنے لگیں۔ اَدھ جلی لکڑیوں پر پانی ڈال کر انھیں سرد کیا جارہا تھا۔ بجھتی لکڑیوں میں سے سسکاریوں کی آواز برآمد ہورہی تھی۔ کالا دھواں بھی سفید ہوتا گیا۔ بڑے بوڑھے خوشبو پاکر چاول نگلنے کو تیار ہونے لگے۔ گڑ کی چاش پر پکے چاول دیگچی سے نکالتے چمچ کے ساتھ چمٹ جاتے۔ تھالیوں میں مشکل سے اترتے۔ بوڑھوں، مردوں اور بوڑھیوں کو تھالیاں تھمادی گئیں۔ پکانے والیاں انتظار کرنے لگیں کہ جوان اور بچے واپس ہوں تو ان کو چاول دینے کے بعد وہ بیٹھ کر کھاسکیں۔ کوئی اٹھ کر گلی میں جھانکنے تلاشنے لگی کہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ پیغام کر کے انھیں بلایا جائے۔ کیچڑ بھری گلی میں جاتے ماما پیرل پر اس کی نظر پڑی۔

"ماما پیرل، اِدھرے جوسب (یوسف) کو تو بھیجنا۔ کہنا، آکر چاول کھائے۔"

"ہاؤ اماں، ہاؤ!" ماما مغربی جانب جاتی چھوٹی گلی پکڑ کر تالاب کی طرف جانے لگا۔

"ماما، صدورے کو بھی بھیجنا... ماما، بشو (بشیر) کو تو بھیجنا... ماما، اس چھورے نذو (نذیر) کو تو پادر مار کر بھیجنا..."

ماما پیرل کی آواز کر دو تین در اور کھلے۔

"ہاؤ اَمڑ، ہاؤ!... ہاؤ ادی، ہاؤ!... ہاؤ اماں، ہاؤ! فکر ہی نہ کرو۔ ابھی بھیجتا ہوں۔"

ماما تالاب پر پہنچا تو وہاں جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔

"اڑے ماما پیرل!" ماما کو دیکھ کر خوشی کی ایک لہر یہاں سے وہاں دوڑی۔ "آؤ ماما، آؤ۔" اندر تالاب میں کھڑے، درختوں سے چھلانگیں مارتے ماما کو پکارنے لگے۔

"ماما، آ اندر!" کسی شوخے نے ماما کی دھوتی کھینچنے کی کوشش کی۔

"اڑے رکھ لعنت ہو! ماما کی گوڈ اتار رہا ہے حرامی!" کسی نے اسے جھڑکا۔

رُگو: صرف۔ پادر: جوتا۔ گوڈ: دھوتی

''نہ بیٹا، نہ! ایسے نہ۔ گوڈ کیوں پکڑ رہے ہو؟ اتنا شوق ہے تو صاحب کو خود پکڑ لو!'' ماما نے ساتھ اشارہ کیا۔ ماما پیرل کا جواب قہقہوں کا طوفان لایا۔

''ماما، اچھا کیا تو نے اس کا! کالا منھ ہوا نا تیرا حرامی؟ ماما کی گوڈ میں ہاتھ ڈالتا ہے۔''

''دیکھو تو سہی، کل کلاں کی پیدائش ہماری گوڈ میں ہاتھ ڈالتی ہے! پر آخر کیوں؟ ہوگا نا کوئی شوق اس کو!'' ماما نے دھوتی کھینچنے والے کو تالاب سے باہر نکلتے دیکھ کر کہا۔

کھینچنے والا یہ سن کر گاؤں کی طرف بھاگا۔

''بھلا نہیں جائے گا حرامی!'' دو تین شغل میں اس کو پکڑنے دوڑے۔

''ابا چھوٹے بچے سب گھر جاؤ۔ طاہری جا کر کھاؤ۔ جاؤ شاباش!'' ماما بچوں کو تالاب سے نکال کر گھروں کی طرف بھیجنے لگا۔ ''اب تم لوگ بھی چلو، چاول جا کر کھاؤ۔''

ماما کی بات پر سب اس کے ساتھ تالاب سے نکل کر گیلے کپڑوں میں گاؤں کو جانے لگے۔

''ماما، اچھا علاج کیا تو نے اس کے کیڑے کا۔'' خمیسو ماما کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گیلے بال، گیلا جسم۔

''کس کے کیڑے کا خمیسا؟''

''ماما، اسی ربو (رب نواز) کا۔''

''اڑے یار، تو بھی صفا سودائی ہے۔ رات گئی بات گئی، تو ابھی تک اس کی دُم پکڑے بیٹھا ہے۔ چھوڑ اس بات کو! یہ بتا، چاول کتنے کھائے گا؟''

''ماما، تھال کوئی تو کھا جاؤں گا۔''

''بس؟ رَگو ایک تھال؟'' ماما مایوسی سے بولا۔ ''تیرا تو حال ہی کوئی نہیں یار!''

''ماما، تُو بھلا کتنے کھائے گا؟''

''میں کھاؤں گا پورا دیگچہ! ایسے سمجھا ہے کیا؟''

''مار! ماما، پورا دیگچہ؟ پھر گھر والے کھائیں گے کیا؟''

''وہ کھائیں گے اپنا نصیب! بھلا ایسے کر، ان کے لیے تو لے آ۔ گوٹھ کا اتنا حق تو ہے۔''

طاہری: گڑ والے چاول۔

''واہ ماما، تیرا انصاف! اکیلے دیگچہ چٹ کر جائے اور ہم اپنے بھی تیرے پاس لے آئیں!''

''اڑے تو مت لانا۔ کنجوس، کنجوس کے بیٹے!''

''ماما، جائی لے آؤں؟''

''اڑے چریا، ایسے کہہ رہا تھا۔ چاول بہت! آ کر ہمارے ساتھ کھا۔ تیری مامی بہت اچھے بناتی ہے۔''

ماما گھر اندر داخل ہوا۔

''ماما، پھر ہم چلتے ہیں۔''

''ہاں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔''

وہ صحن عبور کر کے باورچی خانے میں گھسا تو بیوی سر کو ہاتھ دیے بیٹھی تھی۔

''خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟''

''بس سائیں، میری قسمت ہی ایسی ہے۔ چاول لگ گئے ہیں۔ اب بچوں کے کیسے پورے ہوں گے؟''

''اڑے، صفا چری ہے۔ یہ کھرنڈ لگے مجھے دینا سارے۔''

بیوی ویسی کی ویسی بیٹھی رہی۔

''اڑے چری، سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے یہ ایسے اچھے لگتے ہیں جو کیا بتاؤں۔ دیتی ہے یا میں خود نکالوں؟'' بیوی نے چاول ڈالے اور نیچے سے سارے کھرنڈ لگے چاول نکال کر تھال بھر دیا۔ وہ وہیں جم کر چاول کھانے لگا۔

''آ تو بھی میرے ساتھ کھالے۔''

''نہ سائیں، توبہ توبہ! دیکھ تو سہی کہہ کیا رہا ہے؟ سارا لوک ہنسے! پہلے ہی کہتے ہیں میں نے تمھیں تعویذ پلائے ہیں۔''

''یہ تو خیر سچی بات ہے۔'' پیرل ہنس پڑا۔

''اگر یہ سچی بات ہے تو ایسی رن کو گھر سے نکال باہر کرو۔ گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟'' بیوی

جائی: بیچ میں۔ چریا، چری: پاگل۔

تپ گئی۔

''اڑے ایسے ہی مسخری کر رہا تھا۔''

''یہ مسخری کی بات ہے؟ پہلے ہی لوگ طعنے مار رہے ہیں، تم بھی مارو!''

''اڑے دلڑی، تم بات بات پر آگ ہو جاتی ہو۔''

''تم بات ہی ایسی کرتے ہو۔ جان بوجھ کر آزار دیتے ہو۔ لوگ الگ آزاریں، تم الگ!'' بیوی کا مکھ دکھ سے بھر گیا۔

''چری، میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔''

''لوگ بھی ایسے ہی کہتے ہیں۔''

''اڑے، لوگوں کی باتیں ہوائیں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے زور تھوڑی ہوتا ہے۔ ان کی باتوں کا کیا رنج!''

''زور ہے اسی لیے تو تُو بھی کہہ رہا ہے، تعویذ پلائے ہیں۔ کل کو یہ بھی کہے گا، اس رن کو اولاد نہیں ہوتی۔''

''یہ اولاد کا کس نے کہا؟''

''سب کہتے ہیں۔ کہتے ہیں، باہر جا پڑا، غیروں سے لے آیا۔ اب ہو اولاد تو دیکھیں۔''

''بڑی خبیث زبانیں ہیں۔ کسی کو بستا ہوا برداشت نہیں ان کو۔ خانہ خراب ہو ان کا! پر تُو چھوڑ اس بات کو۔ بھلا کنویں اور لوگوں کے منہ کبھی بند ہوئے؟ ہاں، اپنوں میں سے کسی نے کہا ہو تو میں حساب دوں۔ ادی صغریٰ کبریٰ نے کہا ہو، نانی برکت نے کہا ہو تو میں میاری۔''

''پر سائیں، اتنا وقت ہو گیا ہے، کوئی آسرا نہیں اب تک۔''

''اڑی چری، ایسے نہیں کہتے۔ آسرا کیوں نہیں؟ آسرا مولا میں ہے، اور دیکھ ابھی سال ہی تو ہوا ہے۔''

''سال سے مہینے تو چڑھ گئے ہیں۔''

''دیکھ سلیمت، دینے والی ذات وہ ہے۔'' پیرل نے اوپر اشارہ کیا۔ ''اس کے پاس کبھی کمی

میاری: خطاوار۔

ہوئی؟ کبھی ایسی خبر آئی ہے کیا اس کے پاس کمی پڑ گئی ہے؟"

"توبہ کر سائیں، کیا کہہ رہا ہے! اس کے پاس کمی کیوں ہوگی؟ بس میرا دل کسی کسی دم بیٹھ جاتا ہے۔ بھلا سائیں بخشت شاہ بادشاہ کے پاس چوک رہ آؤں۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں خود ساتھ چلوں گا تیرے۔ بس دریا بادشاہ میں چاڑھ ہے۔ پانی کچھ اترے، کچھ میں دو پیسے جوڑ لوں تو چلتے ہیں بس۔"

"رب سائیں جلد وہ دن لائے جب میری مراد پوری ہو۔"

"مراد ایسے پوری ہوگی کہ ایک نہیں، دو دو بیٹے ساتھ ہوں گے، دیکھنا! تُو ایسے دل چھوٹا کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ چاول کھا، یہ اَجائی باتیں چھوڑ۔"

"تم جاؤ، میں کھاتی ہوں۔"

"میرے سامنے مت کھانا کبھی!"

"مجھے شرم آتی ہے نا! اب تم جاؤ۔"

بیرل خالی تھال چھوڑ کر اٹھا تو سلیمت نے دیگچہ سامنے رکھا اور تھال میں ڈالنے کے بجائے دیگچے میں سے ہی کھانے بیٹھ گئی۔

بیرل تھال بھر چاول کھا کر پیٹ پھلائے باہر نکلا تو اس پر غنودگی حملہ کرنے لگی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اسے نیندیوں گھیرتی، آنکھیں کھولنا مشکل ہو جاتا۔ رات کو نیند میں دیر سویر ممکن تھی لیکن دوپہر کی نیند خود سلانے پہنچ جاتی۔ ابھی بھی اس پر اونگھ حاوی تھی، مگر بچوں کو شغل دینے کا وعدہ تھا اور بارش کے بعد نیند کرنا بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے۔

بیرل گلی میں نکلا۔ یہ گلی بیرل کے گھر سے شروع ہوتی تھی، یا یوں سمجھیے کہ بیرل کے گھر پر ختم ہوتی تھی۔ بیرل کا گھر گاؤں کے مشرق میں تھا۔ اس کے گھر کی پچھلی دیوار ٹیلے کی اترائی پر ٹھہری ہوئی تھی۔ ٹیلے سے نیچے کھیت ہی کھیت تھے جو حد نگاہ تک چلے جاتے تھے۔ بیرل والی گلی میں دائیں بائیں دو اور دروازے تھے اور پھر یہ گلی گاؤں کی بڑی گلی سے مل جاتی تھی۔ بڑی گلی پورے گاؤں کو دو حصوں

چوک رہنا: مزار پر چار دن رہنا۔ چاڑھ: طغیانی۔ اجائی: بیکار۔

میں کاٹتی درمیان سے چلی جاتی تھی۔ پیرل بڑی گلی میں آیا۔ گلی میں موجود کچی دیواروں کا اوپری حصہ نہایا ہوا الگ رہا تھا، جیسے کوئی نازنین سر پر پانی ڈال کر باقی جسم بھگونا بھول بیٹھی ہو۔ پیرل کیچڑ میں جا بجا انسانوں اور جانوروں کے گزرنے والے نشانات کے اوپر پاؤں رکھتا احتیاط سے چلا جارہا تھا۔ اس کی چپل کیچڑ سیمنٹی وزن دار ہونے لگی۔ پیرل نے دیوار کی جڑ میں چپل مار کر کیچڑ جھاڑا۔ چند قدم سہولت سے چلا، پھر وہی چپل گارے میں بھر گئی۔ چلنا دوبھر ہونے لگا۔ اس کے اندر بند کیفیت تھی۔ اسے اچانک سے سلیمت کی سُونی کلائیاں چبھنے لگیں۔ بہت عرصے سے یہ خیال تھا مگر سونے کی چوڑیاں خریدنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ پہلی بیوی کا کچھ زیور پڑا تھا مگر وہ سکینہ کی امانت تھا۔ تھا بھی اتنا کہ بس اس کی شادی پر تھوڑا بہت ہوجائے، کیونکہ اسی زیور میں سے کچھ بیچ باچ کر اس نے بوقت شادی سلیمت کے باپ کو ادائیگی کی تھی۔

ہوا یوں کہ پیرل کی پہلی بیوی، جو اس کی چچازاد بھی تھی، چوتھے بچے کو جنتے فوت ہوگئی۔ بچہ بھی نہ بچ سکا۔ بس جو لکھے کا نصیب! بیوی کی فوتگی کے بعد بہنوں کو بھائی کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ روز کوئی نہ کوئی رشتہ نکال کر پیرل کے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ پیرل ٹال مٹول کر دیتا۔ سکینہ اچھا خاصا گھر دیکھ رہی ہے، بھلا شادی کی کیا ضرورت۔ مگر بہنوں کو بھائی کی شادی سے کون روکے؟ وہ اسی طرح لگی رہیں۔ پیرل کو بھی وقت کے ساتھ ساتھ ضرورت تنگ کرنے لگی۔ جب پیرل شادی پر تیار ہوا تو وہی سوال سامنے آیا جس وجہ سے وہ ٹال مٹول کرتا تھا۔ ننھیال ددھیال میں رشتہ تھا نہیں اور گاؤں بھر کی لڑکیوں کا تو وہ کئی سال سے ماموں بنا ہوا تھا۔ اس کے خیال سے بات باہر تھی کہ وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے شادی کی سوچ بھی لائے۔ اور رہیں عورتیں، تو بہنوں کو اپنے بھائی کا کسی رانڈ سے شادی کا تصور امرِ محال تھا۔ اسی اُدھیڑ بن میں سال بیت گیا۔ آخر سوچ بچار کر کے وہ اپنے معاملے کو حل کروانے میاں فضل محمد کے پاس چلا گیا۔ بھلا اس کے سوا گاؤں بھر میں کون سیانا آدمی تھا جس سے یہ راز کھولا جائے!

''ماما پیرل، تیری بات سولہ آنے صحیح ہے۔ تو شان شرم والا بندہ ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی جو ساری عمر ماموں کہتے بڑی ہوئیں اب اُن سے بیاہ رچایا جائے؟'' فضل محمد نے اس کی تائید کی۔ طے یہ ہوا، پیرل بے فکر ہوجائے، میاں فضل محمد خود کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔ مہینہ ایک گزرا ہوگا کہ میاں فضل محمد پیرل کو لے کر الگ ہو کر بیٹھا۔

''ماما پیرل، حال احوال سب خیر؟ بات یہ ہے، اِدھر اپنے علاقے میں جو رواج ہے، قوم قبیلے سے باہر کا نہیں۔ وہ کٹمب قبیلے سے باہر وٹہ سٹہ بھی نہیں کرتے۔ باقی خبر چار ملی ہے، اُدھر ہے کوئی گوٹھ، وہ اپنوں سے باہر مٹی مائٹی جوڑتے ہیں۔ میں پتا وتا کرتا ہوں۔ تو دِلجائے کر۔''

پیرل کو اطمینان ہو گیا۔ پتا یہ چلا کہ بات برابر سچی ہے۔ وہ لوگ کرتے تو ہیں، مگر دو پیسے چار پیسے پر۔ ان کا دستور ایسا ہے۔ وہ وٹہ سٹہ بھی کرتے ہیں، مگر میاں فضل محمد کا کہنا یہ تھا، وٹہ سٹہ نہ کرنا ہی اچھا ہے۔ میاں فضل محمد پیرل کے لیے ایک گھر بھی نظر میں رکھ آیا ہے۔ دیکھ ریکھ سے اندازہ ہوتا ہے، اچھا رشتہ ہوگا۔ باقی گھر کی عورتیں جا کر لڑکی کے گن وغیرہ جانچ لیں۔ اب یہ رشتے وشتے کی بات پیرل کے کسی بڑے نے آگے چلانی تھی، میاں فضل کو ایسا اختیار دینا کوئی رواج نہ تھا مگر پیرل کے چچا نے یہ بات مانی تو کجا، برادری سے باہر رشتے کا لفظ بھی سننا نہ تھا۔ میاں فضل رشتے کی بات تو نہیں چلا سکتا تھا مگر یہ بھاری پتھر تو اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنے میٹھے لہجے میں تفصیلی حال احوال دے کر پیرل کے چچا نیک محمد کو اونچائی نیچائی سمجھا کر بات وات سے راضی کر ہی لیا۔ چچا کے بعد پیرل کے دونوں بہنوئی تھے۔ ایک چچا کا لڑکا تھا جو باپ کی رضا میں خود بخود آ گیا۔ باقی ایک بہنوئی کو میاں فضل محمد اور چچا نے رام کیا۔

کار آخر جس واسطے سے وہ رشتہ دیکھنے جا رہے تھے میاں نے اُس بندے کو پیغام کروا کر دن پکا کیا اور میاں فضل محمد، چچا، بہنوئی اور پیرل کی دونوں بہنیں صبح صبح رشتے دیکھنے نکلے۔ میاں فضل محمد کی بیل گاڑی انھیں شہر والے اسٹاپ پر چھوڑ آئی۔ میاں فضل محمد کے دونوں بیل بھاگ ناڑی نسل کے تھے، قد آور اور خوب پلے ہوئے، مگر ہیئت ایسی کہ پتلی ٹانگیں اور پیٹ کا جیسے وجود نہ ہو۔ ہل اور بیل گاڑی دونوں میں خوب چلتے۔ ان کی چال کی وجہ سے میاں انھیں 'طوفان میل' کہتا تھا۔ وہ کہتا، کسی وقت میرے بیٹے بھی مجھے جواب دے سکتے ہیں مگر بیل نہ دیں گے۔

اسٹاپ پر کھڑی گول باڈی بس بھرتی جا رہی تھی۔ عورتوں اور دو مردوں کو اندر جگہ ملی، باقی بچا پیرل کا بہنوئی۔ اسے کلینڈر (کلینر) نے چھت پر چڑھ جانے کا کہا۔ وہ بس کے پیچھے لگی سیڑھی سے چھت پر چڑھنے لگا۔

''یار، اوپر مشکل میں تو نہ پڑو گے؟'' میاں فضل محمد اپنی سیٹ پکی رکھنے کے لیے اس پر اپنا رومال جما کر اس سے پوچھنے آیا۔ اسے خیال تھا کہ کل کلاں بیچ لوگوں میں میار 'شکوہ' نہ دے۔

''اڑے نہ، چاچا فضل۔ سفر کی تو بات ہے، کوئی رات تھوڑی رہنی یہاں۔''

میاں اس کی آواز سے اطمینان کر کے اندر جا بیٹھا۔ بیضوی شکل کی بس جو گول باڈی کے نام سے مشہور تھی، اندر بالکل بھری تھی۔ ڈرائیور کے پیچھے والی چار قطاریں عورتوں کے لیے مخصوص تھیں، باقی مرد ہی مرد۔ بس کے اندر چھولے اور ماوا بیچنے والے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بس چلی۔ لوگ اُترتے چڑھتے رہے۔ بس ان کی منزل پر پہنچی۔ وہ اترے تو میاں فضل محمد کا واقفکار، اس گاؤں کا رہنے والا عبدالرحمان ان کا منتظر تھا۔ عبدالرحمان کے ساتھ وہ قادر بخش کے مہمان ہوئے۔ عورتیں عورتوں کی طرف گئیں اور مرد مردوں کے ساتھ بیٹھے۔ قادر بخش نے چٹائیوں پر نئی رلیاں ڈال کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ مردوں کا آپسی احوال شروع ہوا۔ کھیت فصل، بکری بھینس، اونٹھ بیل، منڈی شہر، یہاں وہاں کی دنیاداری پر بات ہوتی رہی۔ کھانا آیا۔ کھانا کھا کے وہ لوگ ہاتھ دھو کر کلّی کر کے واپس بیٹھ گئے۔ میاں فضل محمد نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا، ناس کی چٹکی دی اور اپنا بھاری ہاتھ دو انگل کی داڑھی پر پھیرتے اصل احوال کی ابتدا کی۔

''بھاؤ (بھائی) قادر بخو (بخش)، حال احوال سب خیر؟ اصل بات یہ ہے، شرع میں شرم نہیں۔ پھر... پھر ہوگا وہی جو اوپر والے نے لکھ دیا ہے، لیکن زمانہ گیری کی رسم ہے، آپس میں بھلا کیا چھپانا۔ باپ باپ جیسا، دادا دادے جیسا۔ مطلب گھوڑے کو دونوں کان ایک سے۔ ایسے نا؟''

''ہاؤ سائیں، برابر۔ بات سچی ہے!'' قادر بخش اور عبدالرحمان سر ہلا کر کہنے لگے۔

''تو بھاؤ قادر بخو، ہم تمھارے پاس سوالی آئے ہیں۔ ہمارا اپنا ہے۔ یہ اس کا بڑا ہے اور چچا بھی۔ یہ اس کا بہنوئی ہے۔ خود پیرل بھی اشراف آدمی ہے۔ اپنا کھاتا پیتا ہے۔ گھر ہے، دکان ہے۔ بس بھاؤ قادر بخو، یوں سمجھو جیسے ہمیں دیکھ رہے ہو ویسا ہے۔ تو بات یہ ہے، بھائی بھائی کے ساتھ سجتا ہے۔ ہم آئے ہیں اس کے رشتے کا خیال لے کر۔ جو دنیاداری ہوگی وہ نبھائیں گے۔ انسان کی بھلا کیا قیمت، لیکن جو رواج ہے ایک مٹھی، دو مٹھی مکئی کے دانے، وہ قربان کریں گے۔ باقی سب خیر ہے۔ ہمارے بارے میں بھی جو پوچھنا وچھنا ہو وہ بھاؤ عدرحمان (عبدالرحمان) سے پوچھ سکتے ہو۔ باقی مڑئی خیر ہے۔''

میاں فضل محمد کی بات کے دوران قادر بخش ایک تنکے سے دانتوں میں خلال کرتا رہا۔ پیرل کا

چچا، بہنوئی اور عبدالرحمان چپ بیٹھے تھے۔ فضل محمد نے بات پوری کی تو اسے اطمینان ہوا، بات ٹھیک طرح کہہ دی گئی۔

''ادا فضل محمد، ایسی بات نہیں۔ تم لوگ چل کر آئے، جی خوش ہوا۔ ہماری آنکھیں تمھاری لاتیں۔ مہمان کے آنے میں ہماری ہی عزت ہے۔ باقی رشتہ وشتہ کرنا دستور ہے زمانے کا۔ بڑے کہہ گئے ہیں، مرنا مہنا نہیں اور بیاہ گالی نہیں۔ پیر پیغمبر کو بھی رشتہ کرنا پڑتا ہے۔ باقی ادا، بات یہ ہے، بیٹی شیر کے کندھے چڑھے گی تو اپنے خوش ہوتے ہیں، اس لیے ان سے صلاح ولاح کرنی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس میں دیر سویر بھی لگ جاتی ہے لیکن پھر بھی آپ کو زیادہ انتظار نہیں کروائیں گے۔''

قادر بخش کی باتیں سنتے جواباً تائید میں سر ہلاتے بیرل کے چچا اور بہنوئی کو لگا کہ برابر قادر بخش والوں کا رواج پیسے ویسے پر رشتے داری کا ہے لیکن آگا پیچھا رکھنے والے لوگ ہیں۔

''بھاؤ قادر بخش، تو نے برحق بات کی۔ رشتے وشتے میں چار بھلے آدمیوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔ لیکن سچی بات ہے کہ میں بیرل کی مٹی مائٹی میں نہیں، ہاں ایک ذات (قوم) کے برابر ہیں لیکن یار، میں ہوں بیچ والا۔ نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔ سو حق انصاف کی بات کروں گا۔ ہم نے بیرل کے باپ کے ساتھ بھی عمر گزاری اور بیرل بھی ہماری آنکھوں کے آگے جوان ہوا۔ پر کبھی اس میں عیب نہیں دیکھا نہ کسی کا حق ان کی طرف سنا۔ صفا شریف اور ماشوق (معشوق) گھر ہے۔ مولا نصیب کرے تو رشتے میں دونوں گھروں کی عزت بڑھے گی۔'' میاں فضل محمد نے بات ختم کر کے دونوں ہاتھوں سے سر پر بندھی بوسکی کی پگڑی کو اِدھر اُدھر کر کے ٹھیک جگہ کی۔

''ادا قادر بخش، میاں فضل محمد کو ہم نے منڈی میں سودا صفائی کرتے دیکھا ہے، خود اس سے کاروبار واپار کیا ہے۔ کبھی اپنی زبان سے چوکا نہیں۔ اس کی زبان عزت دار کی زبان ہے۔ سمجھو پتھر پر لکیر ہے!'' عبدالرحمان اپنے گاؤں والے قادر بخش سے کلامی ہوا۔

''برابر ادا! عزت دار انسان کی نیشانی (نشانی) ہے یہ۔''

''ادا قادر بخش، بڑی خوشی ہوئی تمھارے پاس آکر۔ مولا کرے گا میل ہوگا۔ بڑی عزت مان دیا تم نے۔ اب ہم بھی چلنے کی کرتے ہیں۔''

میاں فضل محمد کا اشارہ پا کر بیرل کا چچا اختتامی لفظ بولا۔ اس سے پہلے وہ خاموش تھا کیونکہ رشتے

کی بات وات کا سارا وزن انھوں نے میاں فضل محمد پر رکھا ہوا تھا۔

''بس ادا، جو بیٹی کا لیکھ ہوگا۔ مولا کرے گا، آپ کا آنا بے کار نہ ہوگا۔ مزید اپنوں سے بات وات کر کے آپ کو خبر کریں گے۔''

قادر بخش کے ان جملوں کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عورتوں کو پیغام کیا گیا۔ وہ چلی آئیں۔ ان کا بہت دل تھا کہ پوچھا جائے، بات بنی کہ نہیں، لیکن راستہ تو ایسی بات کی جگہ نہیں۔ گاؤں پہنچے تو سورج آخری دم پر تھا۔ کیا چرند پرند، کیا انسان جانور، سب گھر پہنچنے کا مشتاق تھا۔ پیرل جو صبح سے جلے پاؤں بلی کی طرح یہاں وہاں پھرے جا رہا تھا، برگد سے ان کے ساتھ چلا آیا۔ وہ سارے پیرل کے گھر بیٹھ گئے۔

''ماما پیرل، مبارک ہو۔ منھ میٹھا کرا، کام باقی تمھارا ہو جائے گا۔'' میاں فضل محمد نے صبح سے سر پر رکھی پگڑی اتار کر اسی بندھی حالت میں گھٹنے کے اوپر رکھ دی۔

''چاچا فضل، رب تیرے منھ میں موتی گلاب۔ پکا ہو جائے گا؟'' پیرل کی چھوٹی بہن کبریٰ بے اختیار بولی۔

''ابا کبریٰ، کوئی اندیشہ ہی نہ کرناں۔ میں اصل آدمی کی آنکھ سے اس کی دل میں جا بیٹھتا ہوں، ہا۔ باقی وہ بھی عزت دار ہیں، بیٹی کو وزن سمجھ کر تھوڑی باہر نکال پھینکیں گے۔ کسی تیسرے چوتھے سے پوچھیں گے۔ پک کریں گے۔ گھر، گھاٹ، دھندھا دیکھیں گے۔ دنیاداری میں سو باتیں ہوتی ہیں۔ وہ تو کرنا پڑیں گی ناں ان کو بابا۔ باقی، آخر میں ماما پیرل سہرا باندھے ہی باندھے۔ سائیں کیسے بھاؤ نیک محمد؟'' میاں نے پیرل کے چچا سے پوچھا۔

''مجھے بھی ان کے ورتاؤ سے ایسا لگا کہ جوڑیں گے، توڑیں گے نہیں۔''

''اب تو تجھے پک ہوئی کبریٰ بیٹی؟''

''ہاؤ چاچا۔ مجھے تو اس دن کا انتظار ہے جب میرا بھائی سہرا باندھے گا۔''

''بھلا تم لوگ اندر کا احوال دو۔ گھر، لڑکی کیسے تھے؟''

''بس چاچا، پوچھ ہی نہیں! لڑکی ایسی تھی ایسی جو کیا بتاؤں، صفا سرخ بیر جیسی۔ لال گلاب۔

پک: یقین۔

میں نے پورے گاؤں میں ایسی نہ دیکھی۔ ہے نا ادی صغریٰ؟'' کبریٰ نے شوق و خوشی میں بولتے بڑی بہن سے تائید چاہی۔

''ہاں۔ چھوکری ٹھیک تھی، پر ایسی بھی نہیں جو میں کبریٰ کی طرح قربان جاتی۔''

''نہ بڑی ادی! ایسی سوہنی تھی جیسے حور پری۔''

''بھلا لچھن کیسے تھے؟'' میاں نے بات کو موڑنا چاہا۔ اس کا خیال تھا، بات ابھی بیچ میں ہے، اس لیے اچھی بات کی جائے۔

''چاچا، بولنے چالنے میں ایسی اچھی جو کسی کو رشتے کے نام سے چاچی مامی کے سوا پکارے ہی نہیں۔ اور گھر ایسا کہ سارا اجھاڑو کیا ہوا، تکیے رلیوں میں ٹانکے کی ایسی صفائی جو ٹانکا ٹانکے سے الگ۔ شکل سے بھی فرمانبردار لگ رہی تھی۔ ادے پیرل کی کنوار بنے گی تو روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش ہو جائے گی۔''

''وہوا! وہوا! ماما پیرل، جو دونوالے ہم نے مچھلی کے اٹھائے اس میں جو مزہ تھا بس کیا بتاؤں۔''

اس محفل میں اس کا کچھ بولنا یا پوچھنا مناسب نہ تھا، وہ چپ چاپ بیٹھا سنے جا رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا، بس یہ باتیں بند نہ ہوں، بھلے صبح ہو جائے۔ رات کا کھانا کھا کر وہ گئے تو پیرل چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے اندر لال کنوار کا ہیولا بن رہا تھا۔ اس کے آنے والے دن سخت ہو گئے۔ وقت لکڑی کی جگہ لوہے کا ہو گیا۔ کاٹے کٹتا نہ تھا۔ لڑکی والوں نے اپنے طور پوچھ گچھ کی، مشورہ مصلحت کیا۔ رشتہ دینے میں بات بنی۔ قادر بخش والوں کے گاؤں کا چنگا مڑس، اپنے ساتھ عبدالرحمان اور ایک دو آدمی کیے، میاں فضل محمد سے ملاقی ہونے آیا۔ کھانا پانی کر کے وہ ساتھ بیٹھ گئے۔ انھیں چنگے مڑس کے بولنے کا انتظار تھا۔

''ادا، مولا سائیں سب کا خیر رکھے، ادا فضل محمد چل کر ہمارے پاس آیا، ہمیں اپنا سمجھ کر رشتہ ڈالا۔ ہم نے بھی آپسی صلاح سلابت کی ہے۔ سب کا خیال ہے، رشتے سے کوئی انکار نہیں، آپ کی عزت ہماری عزت ایک ہے۔ بس شرط شروط ہے کچھ۔''

چنگے مڑس کی پیشانی جھرّی دار اور کھال سخت تھی۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے چونچ نما بھوری آنکھیں دیکھنے کی جگہ گھور رہی تھیں۔ سر پر محراب رکھنے والی سندھی ٹوپی، جس کی سرخ رنگت اُڑنے والے مراحل

کنوار: دلہن۔

سے آگے نکل چکی تھی۔

''بھاؤ حبیب اللہ، آپ کے لکھ تھورے کہ خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ ہم نے عزت لی ہے تو دیں گے بھی۔ جو شرط ورط ہے، ہماری آنکھوں پر!'' میاں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ادا فضل محمد، بات محبت اور مٹی مائٹی کی ہے۔ شرط ورط کیسا، بس زمانہ گیری ہے۔ محبت مائٹی میں نبھانا بھی آسان ہوتا ہے۔''

''برابر! لاکھ روپے کی بات کی تم نے، بھاؤ حبیب اللہ۔ جب نبھانی ہے تو کڑوا گھونٹ بھی میٹھا لگتا ہے۔''

''نہ ادا فضل محمد، نہ! رب ماف کرے، ہم کوئی کڑوا وَڑوا گھونٹ پلانے والے ہیں ہی نہیں۔ جن سے عمر بتانی ہو اس سے کڑوی بات حرام۔''

''بھاؤ حبیب اللہ، دل لے لیا تم نے۔ بہت عزت داری والی بات ہے۔''

''ادا فضل محمد، بس بات کو پورا کرتے ہیں۔ آپ کی پریت میں ہم آپس میں بیٹھے، سب نے رشتے پر ہاں کی۔ سب کی صلاح تھی، اشراف ہیں، لڑکی دینے میں کوئی حجاب نہیں۔ باقی ہماری دو شرطیں ہیں۔ ایک مٹھی مکئی اور وہ گڑ کھا کر۔ بس بات تمام یہی ہے۔ باقی سب خیر۔''

''بھاؤ حبیب اللہ، بالکل اپنوں والی بات کی تم نے۔ یہ شرط شروط تو ہے ہی نہیں۔ اور برابر ہمارے ہاں لینے دینے کے رشتے بھی ہیں، لیکن اصل بات ایسی ہے، بیرل کو رشتوں میں پہلے ہی وزن ہے۔ سو گڑ والی بات کچھ اوکھی ہے۔ باقی جو حکم ہو، ہمیں آنکھوں پر۔''

''ادا فضل محمد، یعنی ایسے؟'' چنگا مڑس سوچتے ہوئے بولا۔ ''بات رکھنی ہے، گنوانی نہیں۔ آپس میں جڑنا اللہ رسول کو بھی پیارا ہے۔ پھر ایسا کرتے ہیں، مکئی کی ایک مٹھی کی جگہ دو کر لیتے ہیں۔ اب خوش؟''

''ہاؤ سائیں، برابر۔ ہم نے قبول کیا!'' میاں فضل محمد نے دونوں ہاتھ سینے پر جما کر ذرا سا جھکتے کہا۔ ''ادا نیک محمد، اٹھ۔ بھتیجے کی خوشی کی مٹھائی لے کر آ تو منہ میٹھا کریں۔''

لکھ تھورے: لاکھ احسان۔

ایک مٹھی مکئی سے مراد لڑکی والوں کے رواج مطابق رقم اور گڑ کھانے کا مطلب پہلی بیٹی کا رشتہ سسر کی مرضی مطابق۔

نیک محمد بتاشے لے آیا۔ منھ میٹھا ہوا اور اگلے چاند کی ساتویں کو پوتی ڈال کر اعلان کرنے کا دن طے ہوا۔ اس شام گاؤں بھر میں بتاشے اور نباتیں تقسیم کی گئیں۔ باقی شادی تک اتنا وقت لگا کہ پیرل کو دوسری مٹھی کے پیسے پورے کرنے کے لیے بڑے شہر جا کر مرحوم بیوی کے جھمکے بیچنے پڑے۔

اگلے چاند کی ساتویں کو پیرل کی بہنیں گاؤں کی چند عورتوں کو ساتھ کر کے پوتی ڈالنے گئیں۔ دلہن کے لیے پانچ سیر سچا گھی، شکر پانچ سیر، سوجی ڈھائی کلو، خشک میوہ دو کلو، پانچ سیر تل، ایک شہد کا شیشہ، دس کلو آٹا، مہندی، ناک میں ڈالنے کا ایک کوکا اور ایک جوڑا کپڑوں کا ساتھ لے کر گئیں۔ پوتی کی رسم میں دلہن کے اوپر گل بوٹے کاڑھے ایک اوڑھنی ڈالی گئی جس کے دو کونوں میں گانٹھیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک گانٹھ میں مصری الائچی بندھی تھیں اور ایک میں روک پیسے۔ پوتی ڈال کر رشتہ پکا کیا گیا۔ اس موقعے پر آنے والی عورتوں میں دلہن کی ماں نے گڑ بتاشے اور مٹھائی بانٹی جو پیرل کی بہنیں تقسیم کرنے لائی تھیں۔
اس سے اگلے ماہ چاند کی تیسری کو پیرل سب مرحلے پورے کر کے دلہن کو ساتھ کیے اپنے گوٹھ واپس جا رہا تھا۔ بارات بڑی نہ تھی۔ پیرل کی پہلی شادی تو تھی نہیں کہ پوری بس بھر کر لائی جائے۔ بس پندرہ سولہ لوگ تھے جن میں بھی اکثریت عورتوں کی تھی۔ ڈاٹسن کے پچھلے حصے میں ٹھنسی عورتیں تالیاں پیٹتی، شادی کے سہرے گا رہی تھیں۔ ڈاٹسن کے اوپر بڑی پیٹی باندھ کر رکھی گئی تھی جس میں دلہن کا جہیز تھا۔ کانسی کی تھالیاں، کٹورے، دیگچیاں، چمچ، بڑا چمچ، توا، سرمہ دانی، شیشہ کنگھی، ان سلے جوڑے، رلیاں، سرہانے اور چٹائی۔ سب کا سب تالہ بند پیٹی میں تھا جس کی چابی دلہن کی ماں کے پاس تھی جو دلہن کے ساتھ موجود ہونے کی خاطر ایک رات کے لیے بارات کے ساتھ جا رہی تھی۔ دلہن دولہا کے ساتھ ڈاٹسن کی اگلی سیٹ پر کبوتر بنی بیٹھی تھی۔ سرخ جوڑا، سرخ دوپٹہ اور مہندی لگے سرخ ہاتھ پاؤں والی دلہن کے پہلو میں بیٹھا محمد پیرل اپنے آپ میں نہیں سما پا رہا تھا۔ اس نے سرخ زری دار آنچل کی اوٹ میں ڈھکے اس مکھڑے کو کیا دیکھا، اس کے من میں گھنگھرو بج اٹھے۔ ستواں ناک میں دمکتا کوکا اس کی دل میں کھب گیا۔ شرم سے گری پلکوں اور گلاب چہرے پر پڑی نظر سے وہ لرزش میں آ گیا تھا۔ وہ دلہن ساتھ کیے ڈرائیور کی بائیں طرف اس رومال کے پیچھے بیٹھا تھا جو ڈرائیور اور دلہا دلہن کے بیچ آڑ کے طور پر باندھا گیا تھا۔ اس وقت

پوتی: منگنی کی رسم جس میں لڑکی کے سر پر اوڑھنی ڈال کر رشتہ پکا ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔

روک پیسے: نقد پیسے۔

تک بھی وہ اپنی شروع ہونے والی لرزش پر قابو نہ کر پایا تھا۔ گاؤں پہنچ کر برگد کے پاس ڈرائیور نے سب باراتیوں کو ڈاٹسن کے اندر اور اوپر سے اترنے کا بولا۔ پرانی ڈاٹسن میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ بھری حالت میں چڑھائی چڑھ جاتی۔ باراتی بڑبڑ کرتے ڈاٹسن سے اترنے لگے۔ اتنی دیر میں غل مچاتے بچے کٹھے ہو گئے۔ وہ ماما کی دلہن دیکھنے کے لیے مکھیوں کی طرح گر رہے تھے۔ بڑوں نے گھرکی دے کر انھیں دور کیا۔ ڈاٹسن گھر رگھرر کی آواز کرتی، دھواں چھوڑتی، رک رک کر اوپر چڑھنے لگی۔ بڑی گلی میں ماما والی گلی کے منھ پر ڈاٹسن رکوائی گئی۔ ماما پیرل اور دلہن اترے۔ اب عورتوں کا خوشی میں ملبوس ہجوم بچوں پر غالب آ گیا۔ گاؤں بھر کی عورتیں ٹہوکے دیتی، ہنستی، غل مچاتی اکٹھی ہو گئیں۔ بڑی بوڑھیاں قوم ذات سے باہر رشتہ ٹانکنے پر اپنا غصہ پھینک کر دلہن دیکھنے دوڑی آئیں۔ دہلاری کے ڈھول کی ڈم ڈم سب پر بھاری پڑنے لگی۔ بچے جو پیچھے دھکیلے جا چکے تھے وہ ڈھول کی آواز پر ناچنے لگے۔ ماما پیرل اترا، دلہن کو لے کر گھر کی طرف چلنے لگا، مگر سامنے سہرے گاتی، تالیاں بجاتی عورتوں کا بند بندھا ہوا تھا۔ دو قدم بھی اٹھائے نہ گئے ہوں گے۔ وہ وہیں کھڑے رہے۔ کچھ جلد باز وہیں کے وہیں دلہن کا گھونگھٹ سرکا کر دیکھنے پر بے صبر ہو رہی تھیں۔ پیرل کی بہنوں اور دوسری قریب رشتے دار عورتوں کی آواز صحرا میں صدا تھی جو کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ''ادی، راستہ چھوڑو!'' کی گردان پڑھے جا رہی تھیں۔ سامنے ہجوم چٹانی دیوار کی طرح جما تھا، یوں کہ چیونٹی بھی راہ نہ پائے۔

''ہٹ جاؤ، تمھاری نانی مر جائے!'' ماما پیرل کے منھ سے بے اختیار الفاظ چھوٹ گئے۔ کیا لڑکیاں کیا عورتیں، سب ہنسی میں شرابور ہو گئیں۔

''ماما، آج تو نانی کو بخش دو!'' کسی نے شوخ آواز میں ٹھٹھا کیا۔ ماما جس کے پاس ہر ایسی بات کے دو تین جواب تیار رہتے تھے، جانے کیوں جھینپ گیا۔ اسے چپ دیکھ کر عورتیں شیر ہونے لگیں۔

''ماما، بھلا کر آج کاروائی۔''

اس بات پر تو ماما بوکھلا گیا۔ قہقہے اڑنے لگے۔ ڈھول کی آواز ہی مدھم ہو گئی۔ شاداں عورتیں کھلنڈری ہوتی گئیں۔

''ماما، اپنی کھاٹ تو مضبوط بنائی ہے نا؟''

دہلاری: ڈھول والا۔

''ماما کو سال ہو گیا ہے انتظار میں۔ ابھی بھی کھاٹ مضبوط نہ بنائے گا کیا!''

''ماما، ادوان میں کھینچ دوں۔ ڈھیلی ہو گی تو پوری رات چارپائی بولتی رہے گی۔''

خدا خدا کر کے انھیں ماما ہاتھ آیا تھا، آج تو سب نے اپنے حساب چکانے تھے۔ ماما کے پسینے چھوٹے جا رہے تھے۔

''ماما، آج تو تیری آواز ہی بند ہے۔ لگتا ہے، حال ہی نہیں۔ دودھ مکھن لے آؤں کیا؟''

''نہ ادی، ایسا نہ کرنا! ماما دودھ مکھن کھا کر لات سیدھی کر کے پڑ جائے گا، پھر کنوار ساری رات تمھیں کوسے گی۔''

اب ماما ہراسانی کے عالم میں گھر کی طرف جانے کو زور لگا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پہنچ کر ہی وہ نجات پا سکتا ہے۔

''ماما، یہ تو بتا، حکیم و کیم سے لکھ تو لائے ہو نا؟ نہیں لائے تو ہم کسی سے لے کر دیں۔ گوٹھ کی عزت کا سوال ہے!''

''ہاؤ ماما! ایسے نہ ہو کہ کنڈی بجاتے کام ہو جائے۔ دروازہ تو کھولنا۔''

عورتیں تاک تاک کر نشانہ پر نشانہ مار رہی تھیں۔ ماما کے بس میں کچھ نہ تھا۔ ماما کی بہنیں تک ہنس ہنس کر پاگل ہو رہی تھیں۔ آخر کار گھر میں آئے، دلہن کو کمرے میں سیج پر بٹھایا گیا۔ عورتیں گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر دلہن کا منھ دیکھنے لگیں۔ ہر دیکھنے والی چند روپے دلہن کی جھولی میں رکھ کر آگے بڑھ جاتی۔ اب تبصرے ہو رہے تھے۔

''واہ ماما، تیرے بھاگ!''

''اَئی ایسی سفید دلہن تو دیکھی نہیں میں نے! ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائے۔''

''مورنی ہے مورنی!''

''لگتا ہے اللہ سائیں نے بیٹھ کر بنائی ہے!'' سرخ سفید دلہن دیکھ کر سانولی رنگت کی عادی عورتیں محوِ حیرت تھیں۔ ماما پیرل کی دونوں بہنیں فاخرانہ انداز میں سر تان کر کھڑی تھیں۔ ماما عورتوں کے گھر سے نکلنے کے انتظار میں رہا جو کہ طویل رہا۔ رات گئے تک عورتیں آپس میں بولی گئی باتوں کو دہرا

لکھ: مردانہ طاقت کی دوائی۔

دہرا کر ہنستی رہیں۔ جب ہر ایک نے گھر کی راہ لی تو بہنوں نے کچھ دیر کے لیے بھائی کو کمرے سے نکالا۔ دلہن کی ماں اُس کے کان میں خانگی زندگی کا راز سمجھانے لگی۔ اب دلہن کو پائینتی کی طرف کر کے بٹھا دیا گیا۔ پیرل نے سیج پر بیٹھ کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اس کے مکھ کو بیٹھ کر تکا تو وہ بچوں ایسی حیرت وخوشی میں محو ہو گیا۔ اس نے بے اختیار اس کا گال چوم لیا۔ دلہن کے چہرے پر لالی چھا گئی۔

''مجھے تو پتا ہی نہیں تُو میری کس نیکی کا صلہ ہے۔ ایسی سوہنی بیوی تو بادشاہ کی بھی نہیں ہوگی!''

دلہن کا سر اور جھک گیا۔ ''منھ تو اوپر کر میرے سائیں!'' پیرل نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر چہرہ اونچا کیا۔ ''میرا تو دل کر رہا ہے، بس تجھے دیکھتا رہوں اور موت آجائے...'' محبت سے چور لہجے میں پیرل بولنے لگا۔

''ایسے تو نہ بول سائیں!'' دلہن نے گھبرا کر مہندی رنگا ہاتھ اس کے منھ پر رکھ دیا۔

''تو خود دیکھ، میرا دل کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔'' پیرل نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ دلہن مسکرا دی۔ ''میں نے تو خواب میں بھی تیرے جیسی حور پری نہیں دیکھی۔'' اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر چوما۔ ''کچھ کھاؤ گی؟ بھوک لگی ہے؟'' بیوی نے ناکاری میں سر ہلایا۔ ''بھلا تھوڑا دودھ پی لو۔'' پیرل نے دودھ سے بھرا کانسی کا گلاس اٹھا کر آگے کیا۔ گلاس پر پھول پتیاں بنی تھیں۔ دلہن نے دو گھونٹ پی کر گلاس واپس کر دیا۔ پیرل منھ لگا کر اسی جگہ سے دودھ پینے لگا۔

''یا اللہ، سائیں! تم نے پینا تھا تو بتاتے۔ میں نے پہلے پی لیا۔'' دلہن پریشان ہو گئی۔

''مجھے اور کیا چاہیے؟ یہی تو میں چاہ رہا تھا۔'' پیرل عشق میں سرشار تھا۔ اس سے بوڑھے بوڑھیوں کا سکھایا اصول ہی بھولا ہوا تھا کہ بیوی کو پہلی رات سے اس کی اوقات میں قابو کر کے رکھنا چاہیے، ورنہ سر چڑھ جاتی ہے تو اترتی ہی نہیں۔ ''میں اتنا خوش ہوں، اتنا خوش ہوں جو مجھے سمجھ ہی نہیں آرہی میں کیا کروں! بھلا تمھیں گود میں اٹھا کر ناچوں؟''

''نہ سائیں، کیا کہہ رہا ہے!'' دلہن لجا گئی۔

''بھلا جلال چانڈیو کا کلام سناؤں؟''

''مجھے یہ بے سُرا اچھا ہی نہیں لگتا۔''

''ہاں؟ اچھا نہیں لگتا؟ چل پھر بھلا روبینہ حیدری کا کلام؟''

میاں بیوی کے درمیان بات چیت سے اجنبیت کی دیوار ڈھے رہی تھی۔ اندر پتلے گارے سے لیپ کیے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ ملاعبت کا آغاز ہنوز نہ ہوا تھا۔ پیرل کے اندر ابھی مردانہ جذبات انگیختہ نہ تھے۔ شاید خوشی کی بوچھاڑ اتنی زیادہ تھی کہ دھیان اسی پر تھا۔ لیکن دلہن کے اندر یہ بات چل رہی تھی کہ وہ سب اسی رات ہونا ضروری تھا تا کہ سیج پر اس کی ماں کی بچھائی سفید چادر پر سرخ دھبے پڑ جائیں۔ اور صبح یہ دھبے دار چادر ماں نے سب عورتوں کو لہرا کر دکھاتے ہوئے بیٹی کی پاکیزگی پر مہر ثبت کرنی تھی۔ ابھی رات تھی اور صبح بہت دور۔

پیرل وزنی چپل گھسیٹتا برگد کے نیچے پہنچا۔ بچتے بچاتے بھی اس کی دھوتی پر کیچڑ لگ گیا۔ زیادہ چھینٹے وہ تھے جو دوڑتے ہوئے بچوں کے پیروں سے اڑے۔ ماما کو دیکھ کر کچھ شے شغل لینے اور کچھ گھروں سے پیسے لینے دوڑے۔ خوشی نے ایک بار پھر گاؤں کی گلیوں میں انگڑائی لی۔ ماما نے چھپر کے نیچے جا کر پیٹی کھولی۔ چھت پر گارے کے لیپ نے بارش کو گھسنے نہ دیا تھا۔ بچوں کو شے لیتے دیکھ کر برگد کے نیچے بیٹھے بڑے بھی موسمی اثر تحت بچوں کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ قند کی ڈلیاں، بتاشے، سوکھے انگور، پودینے کی ٹکیاں۔ ماما کا سارا سامان کم پڑ گیا۔ اس کی جو بیوی بچوں کے لیے بچانے کی عادت تھی وہ بھی کام نہ آئی۔ چاچا دینو زبردستی صندوق میں سے بچی کھچی چیزیں سمیٹ کے لے گیا۔ ”سارے خیر ہوگئے!“ ماما نے صندوق دیکھ کر کہا جو ایسے خالی ہو گئی تھی جیسے کچھ رکھا ہی نہ تھا۔ ماما صندوق کا ڈھکنا بند کر کے برگد کے نیچے بیٹھ گیا۔ برگد کے نیچے کیچڑ کم تھی۔ لوگوں نے سوکھی جگہیں سنبھال رکھی تھیں۔ آسمان پر بادل ابھی بھی کھڑے تھے۔ شاید زمین والوں کی خوشی دیکھنے کا من تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بچے گاؤں کی طرف دوڑ گئے تھے۔ آج انھوں نے ماما کی 'کاروائی' کا انتظار بھی نہ کیا۔

”ماما پیرل، یہ کل اچھا نہیں ہوا۔“ اسے بیٹھا دیکھ کر چاچا دینو نے بات چھیڑی۔

”بس چاچا، بات کو کیا لتاڑیں؟ گند ہی نکلے گا۔“

”لیکن یار پھر بھی، ہر ایک کا اپنا حساب ہوتا ہے۔ آئے گئے کی عزت ہوتی ہے۔ اگر کسی کے پاس بیٹی کی طرف آوت جاوت کا راستہ ہے تو اس کا لیحاظ (لحاظ) تو ہوگا ناں۔“

”چاچا، رات گئی بات گئی۔ بات آٹا تو ہے نہیں کہ بیٹھ کر اسے گوندھیں۔“

''تیری بات ٹھیک ہے، پر چھوٹے بڑے کو دیکھنا ہوتا ہے۔ یہ علی حیدر کو کسی کا شرم ہی نہیں۔ سفید داڑھی ہوگئی ہے اس کی۔ اب بھی نہیں سمجھا تو کب سمجھے گا؟''

''برابر، چاچا دینو صحیح کہہ رہا ہے۔ چاچے علی حیدر نے کام اچھا نہیں کیا۔ بھلا اگر وہ آیا تھا تو ہمیں کیا؟ اس سے ہمارے اوپر تو کوئی بات نہیں آتی نا!'' علو چاچے دینو کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

''یار علو، بات یہ ہے، چاچا علی حیدر باپ کی عمر کا ہے۔ اسے ہم کیا کہیں؟''

''علی حیدر سے گوٹھ میں آج تک کسی نے عزت پائی ہے؟ اس سے یہ امید کرنا ببول سے بیر مانگنا ہے۔''

''چاچا دینو، مجھے پیغام آیا زال کے رشتے دار آرہے ہیں۔ میں سمجھا، جیسے ہمارے ہاں ماں بہن ملنے آتی ہے، کوئی مرد ور دروازے پر چھوڑ جائے گا۔ مجھے کیا پتا چاچا قادر بخش خود آئے گا!''

''ماما پیرل، اس مامرے (معاملے) میں تیری کوئی گلتی (غلطی) ولتی نہیں ہے۔ بھلا تجھے کیا مالوم کہ کون آرہا ہے۔''

''چاچا، پر حق انصاف کی بات ہے، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ چاچا قادر بخش گھر آرہا ہے تو میں اسے روکتا تھوڑی۔''

''برابر سائیں۔ ماما پیرل صحیح کہہ رہا ہے۔ اسے روکنا کوئی چنگا کام ہوتا کیا؟'' وہاں بیٹھے سارے علو کی تائید میں سر ہلانے لگے۔

''میں جب اِدھر آنے لگا تو میں نے اسے گھر بیٹھنے کا بولا، مگر وہ پیر مرد، سو بات کہاں سنے۔ بس اپنے خیال میں چلا آیا۔''

''بس ماما پیرل، یا نصیب۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہوگا نا سائیں۔''

''ہاؤ ماما پیرل، بات علو کی لگتی ہے۔ ہے سب قسمت کا کھیل۔''

''چاچا دینو، میری بات تو سن!'' شیرل نے، جو شہر میں گدھا گاڑی پر بار برداری کرتا تھا، چاچا دینو کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔ سب کی توجہ اُدھر ہوئی۔

''چاچا، پر بیٹی کے گھر جانا بھلا عزت والے کا کام ہے؟ چاچے علی حیدر نے عیب صواب بولا تو

زال: بیوی، عورت۔

کوتاہی اُس کی بھی نہیں۔ بوڑھا آدمی ہے، گیرت (غیرت) کھا کر بول گیا۔ اور گلط (غلط) بات تو نہ بولی اس نے!'' شیرل بات ختم کر کے نتھنوں میں ناس چڑھانے لگا۔ اس کی بات نے ہر طرف خاموشی کر دی۔

''شیرل کی بات میں بھی وزن ہے۔ گیرت سے اوپر تو کچھ نہیں۔'' چاچا دینو اپنے سفید چھدرے بالوں میں ہاتھ پھیرتا سوچ میں پڑ گیا۔

''یار تم لوگ بھی انسا پھ (انصاف) کرو۔ چاچے علی حیدر کا کوئی ماما کے سسر کی طرف حق حساب رہتا تھا کیا جو اس کی بے عزتی کی؟ چاچا گیرتی مڑس ہے، گیرت میں کہا اور سچ کہا!'' شیرل کی آواز بلند ہو گئی۔

''ادے شیرل کی بات سیر پر سوا سیر ہے سائیں۔ گیرت ایمان ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں''، کسی اور نے بھی آواز میں آواز ملائی۔

''پر شیرل، آیا ہوا رب کی طرپھ (طرف) سے ہوتا ہے۔ عزت اس کا حق ہوتی ہے۔ آئے ہوئے کو کھون (خون) بھی معاف ہے۔'' علو نے شیرل سے اختلاف کیا۔

''دیکھ علو، بات تیری بھی برحق ہے، پر کھون کی بات ہوتی تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ گیرت کی بات ہے۔ گیرت ہزار کھون سے زیادہ ہے۔ سمجھے؟ چاچے علی حیدر پر کوئی میار نہیں۔ اور گیرت میں صحیح گلط کچھ نہیں ہوتا۔ چاچے علی حیدر نے ماما کے سسر کو کون سی کھلاڑیاں ماریں جو تم اتنا بول رہے ہو؟ وہ اسے یہ نہ کہتا تو کیا ہار پہناتا جو وہ اپنی بیٹی کے گھر بے گیرت بن کر آیا ہے؟ اور کل کلاں سارے علاقے والے کہتے، ماما کے گھر سسر آتا ہے، تو بے عزتی کس کی ہوتی؟ ماما کی یا چاچے علی حیدر کی؟'' شیرل کی اس بات کے بعد کسی کے لیے اس بات پر بولنے کو کچھ نہ رہا۔ بیٹھے ہوؤں کے دل شیرل سے اتفاق کرنے لگے۔ ماما نے زبان سے تو کچھ نہ بولا مگر شیرل کی باتیں اس کے لیے پانی کی قطروں جیسی تھیں جنھوں نے خدشات کی چنگاریوں کو بالکل بجھا دیا۔

گاؤں کے بیچ یہ قصہ چلتا پھرتا رہا۔ پھر لوگوں نے کسی اور بات کو کہانی بنانا شروع کر دیا اور اسے بھول بیٹھے۔ لیکن ماما پیرل کا معاملہ الگ تھا۔ کبھی یہ باتیں اس کے دل سے نکل جاتیں تو کبھی پیر تسمہ پا کی

طرح اس پر سوار ہو جاتیں۔ اکثر وہ خود کو چاچا علی حیدر کی طرف پاتا اور اس کے طرزِ عمل کو درست جان کر ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ پھر جب بیوی کو دیکھتا تو اس کے اندر پڑی دکھ کی گرہ اسے صاف نظر آتی، جیسے شیشم کی صاف لکڑی میں پڑی کالی بھنور گانٹھ اسے دور سے دکھ جاتی تھی۔ بیوی کی ہنسی جو پہلے بلوری شیشہ کی طرح تھی، اب تڑخ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر اسے غصہ آنے لگتا۔ چاچا علی حیدر پر، شیرل پر، اپنی قوم قبیلے کے رواج پر۔ مگر یہ غصہ اسے اپنے اندر چھپانا پڑتا۔ اسے وہ کہیں ظاہر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ روزمرہ کے معمولات چلتے رہے۔ ماما اسی طرح پنگھوڑے، چارپائیاں، دروازے اور ہل کلہاڑی کے دستے بناتا رہا۔ ہٹی پر بچوں کا اُدھم، برگد کے نیچے چلتی کچہریاں اسی طرح جاری رہیں، مگر وہ بات وہیں کی وہیں رہی۔ اس کی دل میں کیل گڑ گئی تھی۔ اور وجہ یہ تھی، وہ فیصلہ ہی نہ کر پاتا تھا: بارش سے ایک دن پہلے والے قصے میں جو ہوا تھا وہ ٹھیک تھا یا غلط؟ ویسے چاچے علی حیدر سے صاحب سلامت قائم تھی۔ آپس میں بھائی بندی تھی۔ صرف اس بات پر چاچا علی حیدر غیر تو نہ بن گیا تھا۔

اس سے چھ ماہ سال بعد کی بات ہے، پیرل کو سسر کی بیماری کی خبر ملی۔ سلیمت کی تو پچھلے دن سے بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ برا ہوگا۔ پیرل نے دیر نہ کی اور بیوی کو لے کر سسرال جا پہنچا۔ سسر کو بخار چڑھے دوسرا تیسرا ہفتہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ دن کے وقت پھر بھی سنبھلا رہتا مگر جوں جوں شام ہوتی، بخار سر پر آ بیٹھتا۔ ٹانگیں جکڑ جاتیں۔ سر میں درد، سستی، کھانسی۔ کسی وقت تو نبض ہی ڈوب جاتی۔ پیرل بیوی سمیت جس وقت پہنچا، قادر بخش غنودگی کی لپیٹ میں تھا۔ گھریلو ٹوٹکوں سے لے کر حکیم کی پھکیوں تک سب آزمایا جا چکا تھا، مگر کوئی بھی چیز اثر ہی نہیں کر رہی تھی۔ اب انگریزی علاج کے واسطے ڈاکٹر کے پاس جانا ہی باقی رہا تھا مگر اس کے لیے پیسے ڈوکڑ چاہیے تھے جو قادر بخش کی دھوتی کے پلّو سے بندھے تھے۔ روپے پیسے والی پیٹی کی چابی قادر بخش دھوتی کے پلّو سے گچھے کی صورت میں باندھے رکھتا تھا، اس لیے سب ڈر میں تھے۔ کس میں جرأت تھی کہ سانپ کو بل سے نکالے۔ پیسے کے معاملے میں قادر بخش ایسا تھا کہ کھال ادھیڑے بنا نہ چھوڑے۔ بیوی کیا، اس کے بیٹے کی یہ مجال نہ تھی جو غنودہ پڑے قادر بخش کی دھوتی سے چابی کھول لے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے، علاج کی تعریف کیا ہے۔ بڑی الائچی، پودینے کی ٹکیوں سے فرق نہ پڑے تو حکیم۔ اور آخر میں ملّا سے دم درود اور دھاگا۔ اس سے آگے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ملّا کا تعویذ ہی آخری حل تھا، اس لیے کہ اسے حکیم

سے دو روپے زیادہ دینے پڑتے۔ نہیں تو قادر بخش کے پاس آخری حل ''لوٹ پیٹ کر ٹھیک ہو جائے گا/گی'' تھا۔

قادر بخش کی غنودگی ٹوٹی اور اس نے پیرل اور سلیمت کو دیکھا تو اٹھا اٹھا آنے لگا۔ ''بڑی عزت کروائی، اب بھاگا آیا ہے حرامی۔ اسے آنے کس نے دیا؟ ابھی کے ابھی اسے نکالو!'' قادر بخش ہوش یا بے ہوشی میں بولنے لگا۔ اس کی سانس چڑھ آئی، پیلا چہرہ سرخ پڑ گیا، سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ پیرل نے وہاں سے چلے آنا ٹھیک جانا۔ باقی سلیمت کیسے واپس ہوتی؟ کچھ بھی کہے، تھا تو باپ ہی، اور ایسی حالت میں چھوڑ آنے کے لیے بیٹی کے پاس پتھر کا دل ہونا چاہیے۔ ''میں رکتی ہوں یہاں۔ ابا ٹھیک ہو جائے تو لے جانا۔'' پیرل نے سلیمت کی بات سنی، پاس پڑے کچھ روپے اسے پکڑائے اور واپس گاؤں آ گیا۔ اگلے ہفتے قادر بخش دنیا چھوڑ گیا۔ آخری وقت میں بیٹا اسے انگریزی علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا مگر ہونی ہو کر رہی۔ بیٹے نے باپ کے مرنے کے بعد دھجی سے اس کے کفن کی پیمائش بعد میں کی، پہلے پیسوں والی پیٹی کی چابی ہاتھ میں کی۔ پیرل بھی سسر کے مرنے پر آیا اور عزیز رشتے داروں کی طرح تین دن تڈے پر بیٹھا رہا۔ چوتھے دن اکیلا واپس گاؤں چلا گیا۔ اس نے بیوی کے دکھ کا اندازہ کیا اور مناسب جانا کہ باپ کی فوتگی کے بعد چالیسویں تک وہ وہیں رہے تو اچھا ہے۔ چالیسویں پر قادر بخش کے بیٹے نے خیرات کی اور دیگیں اتاریں۔ دیگیں تو دو تین ہی اتریں مگر اس فضول خرچی پر قادر بخش کا بس چلتا تو وہ قبر سے نکل کر بیٹے کو قبر میں گاڑ آتا۔

چالیسویں کی شام پیرل بیوی کو لے کر جانے لگا تو رکاوٹ پڑ گئی۔

''ابا کہہ کر گیا ہے تمھیں اس کا مرا منہ نہ دیکھنے دیں، تُو دری سلیمت کو ایسے لے جانے لگا ہے!'' پیرل کا سالا اس کے منھ پر کھڑا ہو گیا۔

''ادا سرو (سرور)، یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' پیرل نے اپنے سے چھوٹی عمر والے کو سامنے زبان چلاتے دیکھا تو اسے یقین نہ آیا۔

''کیا کہہ رہا ہوں؟ بہرے ہو؟ سنائی نہیں دیتا؟ چل نکل یہاں سے!'' پیرل کے سالے نے اسے دھکا مارا۔ پیرل لڑکھڑا گیا مگر موت کے گھر میں کھڑا پیرل تکرار کیا کرے۔

تڈے پر بیٹھنا: کسی کی فوتگی پر وارث کا تین دن نیچے چٹائی پر بیٹھ کر تعزیت وصول کرنا۔

''ادا سرو، آپس میں ہیں، یہ چھوٹی موٹی باتیں...'' پیرل نے بات سنبھالنا چاہی مگر سرو مرنے مارنے پر آمادہ تھا۔ اس نے پیرل کو بات پوری کرنے نہ دی۔

''چل پھوٹ یہاں سے! دوبارہ آیا ہے ناتو میں ذمے دار نہ ہوں گا۔''

پیرل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے، اور سلیمت چپ کھڑی کانپے جا رہی تھی۔

''تُو یہاں کیوں کھڑی ہے؟ چل اندر!'' چھوٹا بھائی سلیمت کو آنگن سے اندر دھکیل کر لے گیا۔ ماں اور سلیمت سے بڑی بہن بت بنی بیٹھی تھیں۔ ''میں آخری بار کہہ رہا ہوں، عزت سے چلا جا!'' سرو پیرل کی طرف پلٹ آیا۔

پیرل گاؤں چلا آیا۔ اس کے اندر تلاطم تھا۔ اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ برگد کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے روا روی میں سلام کیا اور ہٹی کھولنے کے بجائے گھر کی راہ لی۔

''ماما، آج مڑئی کچھ جلدی میں لگ رہے ہو۔''

''ہاؤ یار، بس پھیرا کر کے آتا ہوں۔'' ماما نے بولنے والے کی طرف دیکھا تک نہیں۔

''ماما، کوئی حال کوئی احوال۔ کوئی دھمکی، کوئی دھماکا؟''

''بس، میں آتا ہوں ابھی۔'' ماما نے بدقت بات نبھائی، ورنہ اس دل ایک لفظ بھی بولنے کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ گھر جا کر چارپائی پر پڑ گیا۔

''بابا، ماسی نہ آئی؟'' سکینہ نے باپ کو اکیلا آتے دیکھا تو بھاگی آئی۔

''آجائے گی، آجائے گی۔ تو جا۔ جا کر کام کر۔''

پیرل ایسے ہی پڑا رہا۔ بے چینی میں چین کہاں؟ بے قراری بہت تھی۔ کبھی اس کروٹ لیٹتا کبھی اُس کروٹ۔ اضطراب نے اسے کھڑا کیا اور میاں فضل محمد کے دروازے پر جا کھڑا کیا۔ حواس میں وہ اپنی آواز سے آیا۔ ''ود چاچا فضل، ود ہوئے!'' اس نے اپنے آپ کو پکارتے پایا۔ گھر سے کسی عورت نے ماما کو بتایا، میاں زمین پر نکلا ہوا ہے۔ ماما گلی میں جنوب کی طرف گاؤں سے نکل کر ٹیلے سے اترتا چکر کاٹ کر پگڈنڈیوں پر چلتا فضل محمد کے کھیت پر جا پہنچا۔ میاں انگرکھے کی گدڑی بائیں کندھے میں لٹکائے، پنڈلی پنڈلی تک پانی میں پاؤں گھسائے، اس کھیت کے اندر تھا جس میں پانی کا ہموار قالین بچھا ہوا تھا۔ میاں کے کندھے میں لٹکی گدڑی گیلی گندم سے بھری تھی۔ وہ گدڑی سے مٹھی بھر گندم کے

دانے نکال کر یوں ہاتھ سے جھٹکتا کہ وہ مطلوبہ جگہ کے گھیراؤ میں پانی کے اندر گر کر گم ہو جاتے۔ یہ گندم کی بیجائی تھی جس کے لیے ایک خوبصورت ترتیب و توازن والے اس ہاتھ کی ضرورت تھی۔ یہ میاں فضل محمد نے تجربے سے حاصل کیا تھا۔ میاں ہاتھ کو ایک دائرے میں گھما کر بند مٹھی یوں کھولتا کہ دانے پھینکے ہوے جال کی طرح زمین میں اپنی جگہ پر گر جاتے۔ یہ بیجائی کرنا عام ہاری کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ عمدہ بیجائی کرنے والے ہاتھ چند ایک ہی تھے جو گاؤں بھر میں سب کی گندم کی بیجائی کرتے۔ میاں فضل محمد کو بھی جوان بیٹوں نے باقی کام سے آزاد کر دیا تھا مگر یہ کام اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا۔

"ماما، یہاں کدھر آ نکلے ہو؟" میاں نے اسے دیکھ کر پکار کر پوچھا۔ وہ انھی قدموں پر چلتا، پانی میں لمبے ڈگ بھرتا، ہاتھ کو گردش دیتا، دانے بکھیرتا جا رہا تھا۔

"مڑئی خیر ہے چاچا!" میاں کو ماما پیرل کے الفاظ بے وزن لگے۔ اس کو کھٹک گیا، خیر کچھ کم ہی ہے۔ پر ابھی دو کھیت رہتے ہیں، بیجائی کو آدھے میں روکنا تو ٹھیک نہیں۔ یہ چھورے میرے اتنے بڑے ڈگھے ہو گئے ہیں مگر ابھی تک بیجائی نہ آئی ان کو۔ بس کدال پکڑوا کر کام کروالو ان سے، یہ بھی کوئی بات ہوئی! کدال گدھے کو تھمادو تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔

"ماما، کہے تو کام چھوڑوں۔"

"نہ چاچا، پہلے کام! باتوں کے لیے سارا سورج اپنا ہے۔"

"پکی بات ہے؟"

"ہاؤ چاچا۔"

میاں بیجائی مکمل کرنے لگا۔ ماما بنے پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ میاں کا بیٹا یامین بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ آپس میں بات کو بات سے ملانے لگے۔ میاں نے کام پورا کیا، پانی کی نالی میں کھڑا ہو کر پاؤں پنڈلیوں سے کیچڑ دھو کر ماما پیرل کی طرف آیا۔ یامین بچے ہوے بیج کی بوری اور کدال کندھے پر رکھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

"ہاؤ ماما، کر خیر خبر؟" میاں کام پورا کر کے ماما پیرل کے سامنے بنّے پر بیٹھ گیا۔ پیرل جہاں بیٹھا تھا اس کے سامنے کھیت در کھیت تھے جن کا اختتام گاؤں والے ٹیلے کی جڑ میں ہو رہا تھا۔ پیرل کو اپنے گھر کی دیوار بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے ساتھ علی حسن کی زمین لگتی تھی۔

''چاچا فضل، بس کیا بتاؤں، نہ جیسا خیر ہے۔''

''مولا بھلائی کرے، ہوا کیا ہے ماما؟''

''چاچا، وہ اپنا سرو نہیں ہے، میرا سالا، اس نے بیوی روک لی ہے۔''

''روک لی ہے؟ کوئی حق حساب؟ یا بس ایسے ہی روک لی؟''

''چاچا کیسا حساب؟ بس زورازوری ہے، اور کیا۔''

''یہ چھورا کل کا انڈے سے نکلا اتنا معتبر ہو گیا کہ ہمارا ننگ روک لیا؟''

''بس چاچا، اصل دھکے دے کر گھر سے نکالا مجھے۔ میت والا گھر نہ ہوتا تو لاٹھی کلہاڑی چل جاتی صفا۔''

''ابھی باپ کو گئے پانچ دن نہیں ہوے اور اس کے یہ افعال! یہ آگے چل کر کیا پگڑیاں بندھوائے گا۔''

''پھر چاچا، کیا کریں؟''

''اڑے تو دلجائے کر ماما۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں؟ اس سرو سے وہ حال کریں گے کہ جگ دیکھے گا۔ یہ سمجھتا کیا ہے خود کو؟''

''پھر چاچا؟'' ماما کے وہم وہیں کے وہیں تھے۔

''ماما دیکھ، تکڑ کام شیطانی ہے۔ دودھ جیسی چیز بھی گرم ہو تو منھ جلا دیتی ہے۔ سو ٹھیر ٹھیر کے کام کرنا ہے۔ تو فکر ہی نہ کرناں۔''

''چاچا، بس تیرا آسرا ہے۔''

''ماما، آسرا اللہ سائیں کا ہے، باقی کسر نہ چھوڑیں گے۔ ہو گا ایسے کہ کوئی عزت دار بھلا آدمی بیچ میں کریں گے۔ وہ اس سرو سے میل ملاقات کر کے اس کا اندر کھر چے۔ اگر بات وات سے کام ہو جاتا ہے تو ڈ ہوا۔ اگر نہیں تو وڈیرے علن کے پاس چلیں گے۔ پھر سرو ہو یا پرو، وڈیرے علن سے باہر تو نہ جائے گا ناں ماما۔''

میاں فضل محمد کی بات ماما پیرل کے من میں بیٹھی۔ اسے راستہ نظر آنے لگا۔ پہلے تو کچھ بجھائی ہی

ننگ: عزت، عورت۔ تکڑ: جلدی۔

نہیں دے رہا تھا۔

سردی عقاب کی طرح جھپٹی اور زمین کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔ تالاب میں کھڑے پانی پر پالا جمنے لگا۔ کھیت کی منڈیر پر کھڑی گھاس کی پتیاں کمھلانے لگیں۔ درختوں کے پتے بے وزن ہو کر اڑ گئے۔ لوگ ٹھٹھرنے لگے۔ بچوں کی ناک ریزش بہانے لگی۔ بوڑھوں کی کھانسیاں طویل ہو گئیں۔ بوڑھیوں نے پیشانی پر بندھا پٹی نما دوپٹا اور کس لیا۔ مویشی جھول اور چھت کے نیچے پناہ پانے لگے۔ سورج کو پہیے لگ گئے۔ جو کوئی رضائی چھوڑتا، چولھے یا انگیٹھی پر اپنے آپ کو تاپنے لگتا۔ یہ سب شمال سے آنے والی اتاں ہوا کا کیا دھرا تھا جو بھولے سے کبھی یہاں آ کر ٹھیر جاتی تھی۔ اس دوران ماما پیرل کا حال یہ تھا کہ اس کی رات کا قد دیو جتنا ہو گیا، کاٹے کٹتی نہ تھی، اور دن اجاڑ۔ وقت جوں کی رفتار اختیار کر گیا، بس رینگ رہا تھا۔ معاملے میں خاص پیش رفت نہ ہوئی تھی، جیسے وہیں کا وہیں۔ بس میاں فضل محمد قادر بخش والوں کے چنگے مڑس حبیب اللہ سے مل کر آیا تھا۔ حبیب اللہ کا کہنا تھا، قادر بخش جیسا بھی تھا مگر ہم سے باہر کبھی نہیں گیا۔ اس کی اٹھ بیٹھ کا پتا تھا، اس حساب سے اس سے بات کرتے تھے۔ اس حرام کے جنے سرو کا ابھی پتا نہیں، بھیڑ ہے یا بھیڑیا؟ کچھ زمانہ گزرے تو پتا چلے۔ باقی ہم سے باہر کہاں جائے گا؟ سانپ تو ہے نہیں کہ بل میں گھس جائے، نہ ہی کوا کبوتر ہے جو اڑ جائے۔ بات حبیب اللہ کی انگوٹھی کے نگینے جیسی تھی مگر پیرل اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ دُکھ دل میں اٹک گیا تھا۔ اس کا من کرتا تھا، کسی کو اپنا احوال بتائے، مگر یہ سوچ کر ہی رہ جاتا۔ بھلا بتائے تو کیا؟ بیوی کا غم سن کر لوگ ٹھٹھے نہ اڑائیں گے تو کیا ہار پہنائیں گے؟ گاؤں بھر میں بات اچھلے گی، بیوی کو رو رہا ہے۔ اور مرد کبھی روتا بھی ہے؟ اس کی ہٹی دکان چلتا رہا مگر اب ایسے لگتا جیسے چابی بھرا کھلونا آپے آپ سب کچھ کر رہا ہو۔ اس کی باتوں میں چاشن ختم ہو گئی۔ ماما کی باتوں سے لوگ جو حظ لیتے تھے وہ ماما کو چنگاری دینے کی کوشش کرتے مگر ماما کا حال گیلی لکڑی سا تھا، جلائے نہ جلے۔ ماما کو بھی یہ اچھا نہ لگتا تھا، مگر بات اس کے بس سے باہر تھی۔ اب اس کے معمول میں ایک بدلاؤ آیا کہ اسے جس وقت کام سے فرصت ہوتی، وہ میاں فضل کے پاس چلا جاتا۔ میاں کھیت پر ہے، ماما پیرل وہاں اس کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میاں مسیت میں جمعے نماز پر جا رہا ہے، ماما پیرل ساتھ ہے۔ میاں فضل منڈی پر جانور لینے یا بیچنے جا رہا ہے، ماما پیرل

ساتھ ہے۔ سارے زمانے کی باتیں کی جارہی ہیں لیکن جو اصل بات ہے اس پر نہ سوال ہو رہا ہے نہ جواب مل رہا ہے۔ بھلا پوچھنے کی بات کیا ہے؟ کیا ماما پیرل کا کام میاں فضل کا اپنا کام نہیں؟ کیا میاں فضل ماما پیرل جتنا پریشان نہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ ہر بات نبھانے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے جس پر چل کر ہی کام کیا جاتا ہے۔ پہلے چنگے مڑس حبیب اللہ کے جواب تک انتظار ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ چڑھائی کر کے دوبارہ وہی بات کہی جائے۔ حبیب اللہ کہے گا، ایسے ہلکے لوگ ہیں جو بات پر اعتبار نہ رکھا اور دوبارہ دوڑے آئے۔ دن بیتتے رہے، ماما پیرل کی آوت جاوت میاں فضل کے لیے مشکل کرتی گئی۔ کار آخر وہ جوتی پکڑی کر کے حبیب اللہ کے ہاں جا پہنچا کہ اِدھر آس پاس آنا ہوا تو کہا دو گھڑی ادا حبیب اللہ سے ملتا جاؤں۔ حبیب اللہ بھی سرو کا اندازہ لگا چکا تھا کہ بے وزن لونڈا ہے جس کے سر میں ہوا گھس گئی ہے، اب وہ اسے اوپر اڑائے جارہی ہے، اس لیے اس سے دوبدو بات کرنا اپنی پگڑی اتروانے جیسا کام ہے۔ اب راستہ یہی ہے کہ رئیس علن کے پاس جاکر حق انصاف مانگا جائے۔ حبیب اللہ بھی میاں فضل والوں سے باہر نہ جائے گا، اس سے عزت دار کو عزت ملے گی۔ دوسرے دن ہی میاں فضل ماما پیرل اور ایک دو گاؤں والوں کو ساتھ کر کے رئیس علن خان کی اوطاق پر پہنچا۔ رئیس علن اپنی قوم کا سردار ہی نہ تھا بلکہ علاقے کا سب سے بڑا وڈیرا بھی تھا۔ رخ رواج سے بھلا مانس بھی۔ اس کی اوطاق پر ہر آئے گئے کو عزت ملتی تھی۔ رئیس خود بھی ملنے ملانے کا دلبر آدمی تھا۔ یاری کچہری میں اپنی مثال آپ۔ خاص بات جو رئیس کی پہچان تھی وہ اس کے فیصلے تھے۔ حق انصاف کورٹ دے نہ دے، وڈیرا علن دے گا۔ اور فیصلہ بھی یوں کہ اس پر عمل ہوتا۔ ایسے نہیں فیصلے والے آئے، فیصلہ کروایا اور انگرکھے جھاڑ کر اٹھ گئے۔ کوئی اس کے فیصلے کو پیٹھ نہ دیتا۔ اگر کسی نے فیصلے سے گردن نکالنے کا ارادہ کیا تو کبھی پولیس تو کبھی برادری اس کی گردن ریت کر برابر کر دیتی۔ اور یہ سب ذمہ رئیس کا ہوتا۔ وہ لوگ اوطاق پہنچے تو رئیس خود موجود تھا۔

''اے میاں محمد فضل، خوش راضی؟ ادا پیرل، تم بھی خوش؟ ادا تم بھی خوش؟ سب خیر؟'' خضاب کیے، تیل لگے گھنے بال کنگھی کیے، پیچھے مڑے جیسے ابھی کنگھی پھیری گئی ہو۔ بڑی مونچھیں جنھوں نے گال تک ڈھکے ہوئے تھے۔ بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے رئیس علن موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے مل کر خیر خیریت کرنے لگا۔ اس کی اوطاق بیس پچیس ملاقاتیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہال نما بڑا کمرہ جس میں دیواروں کے ساتھ رکھے موڑھوں پر بیٹھے لوگ رئیس کو اٹھتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ادا پیرل، زمانہ ہوگیا دیدار کو۔ بھولے سے بھی ادھر رخ نہیں کیا! میاں محمد فضل، لگتا ہے پیرل میری طرح رئیس ہوگیا ہے؟" رئیس نے ہنستے ہوئے میاں فضل سے تائید چاہی۔

"نہ رئیس نہ! تو ہمارا بڑا ہے، باپ ہے۔ تیرے پاس نہیں آئیں گے تو کس کے پاس آئیں گے،" پیرل میاں فضل کے جواب سے پہلے بول پڑا۔

"پر یار، تم پر کوئی میار تھوڑی ہے۔ تازی شادی ہے تمھاری۔ ابھی تو بیوی کے انگل (فرمائشیں) بھی پورے نہ ہوے ہوں گے۔"

"نہ بابا! بیوی آپ کے پاؤں کی دھول برابر بھی نہیں۔ بس کمی کوتاہی کی مافی۔" پیرل نے رئیس کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

"بڑے رئیس، ہم نے سنا ہے پیرل کا اصل وہ حال ہے جیسے مرغی انڈوں سے اٹھتی ہی نہیں،" رئیس کے کمدار خانو (خان محمد) نے چہل کی۔

"یہ وری کیسے خانو؟ پیرل کو دیکھ کر ایسا لگتا تو نہیں کہ اس میں چڑے جیسی طاقت ہوگی۔"

"قربان جاؤں بڑے رئیس، پیرل دیکھنے میں فاری ککڑ لگتا ہے پر ہے اصیل۔" خانو کی بات نے لوگوں میں ہلچل مچائی۔ پیرل پر اگرچہ کھلاہٹ طاری تھی مگر رئیس کے آگے یوں ست رہنا نیک فعل نہ تھا۔

"خانو، یہ ککڑ تو ہوگا۔ ہم سانڈ ہیں سانڈ!"

"خانو دیکھ۔ پیرل ہے مکھیوں کا چھتہ! اسے چھیڑ رہا ہے تو۔"

"بڑے رئیس، بات آپ کی صحیح ہے، پر لگتا فاری مرغی ہے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے، یہ روز صبح انڈا بھی دیتا ہوگا۔"

"ہاؤ رئیس۔ خانو کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس لیے آج خانو کے لیے آتے ہوے دو انڈے ساتھ لے آیا۔ بس سردی کی وجہ سے تھوڑا چپک گئے ہیں۔ خانو زور لگائے گا تو اکھاڑ لے گا۔" پیرل کی اس بات پر کون نہ ہنسے؟ رئیس علن کو ہنس ہنس کر کھانسی آگئی۔ محفل بالکل لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"خانو، میں نے تجھے کہا پیرل کو مت چھیڑ۔"

''بس بڑے رئیس، میں نے اصل توبہ کی!''

''ہاں، ہاں! ویسی توبہ جو عورت بچہ جنتے کرتی ہے۔''

''یہ وری کیسے پیرل؟''

''رئیس، بچہ جنتے ہوئے عورت کو جو درد اٹھتا ہے وہ پیر مرشد کا قسم اٹھا کر توبہ کرتی ہے، آگے مڑس کو ہاتھ لگانے نہ دوں گی۔ ادھر چلہ پورا ہوا تو ایسا شوق چڑھتا ہے کہ سوئے مڑس کو کہنیاں مار مار کر جگاتی ہے۔'' ساری اوطاق کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی۔

''خانو ہے جواب؟''

''بڑے رئیس، ہیری توبہ۔''

''چنگا خانو، باتیں چھوڑ۔ مہمانوں سے لسی پانی پوچھ۔ اور میاں محمد فضل، کوئی حال احوال بابا؟ سب خیر؟''

''رئیس، آپ کے سائے میں ہیں۔ مولا آپ کو حیاتی دے، سب خیر ہے۔''

''اچھا اچھا۔ اور کوئی بات وات بابا؟''

''رئیس، یہ اپنے پیرل کا مارا ہے۔ اس کی بیوی رو کے بیٹھے ہیں۔ باقی سب خیر ہے۔''

''یہ وری کیسے، میاں محمد فضل؟''

''رئیس، پیرل کا سسر مرحیات چلا گیا اس جہاں سے۔ پیچھے ہے اس کا کل کا چھورا۔ چالیسویں پر اس نے پیرل کو گھر سے دھکے دے کر نکال دیا۔ بیوی رو کے بیٹھا ہے۔ میں چل کر گیا تھا ان کے چنگے مڑس حبیب اللہ کے پاس بھی، لیکن اس نے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ کہا کہ یہ چھورا نہ دو میں ہے نہ تین میں۔ ہماری نہ سنے گا۔ اس لیے آپ کے پاس حق انصاف کے لیے آئے ہیں۔''

''اچھا اچھا... تو یہ بات ہے۔'' رئیس سوچتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے سوچنے لگا۔

''میاں محمد فضل، بات یہ ہے، اس مامرے کے ہیں دو منھ۔ ایک تم لوگوں کا، ایک پیرل کے سالے کا۔ اب دونوں منھ سامنے ہوں گے تو دیکھیں گے، کس کا وزن زیادہ ہے۔ اب ایسا کرتے ہیں، کوئی دن رکھتے ہیں۔ دونوں طرف سن لیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

''ہاں رئیس، بالکل۔ ہم بھی اسی لیے آئے ہیں کہ حق انصاف ہو۔ جو فیصلہ ہوگا ہماری آنکھوں پر

ہے۔"

"خانو، تُو دیکھ حبیب اللہ اور بیرل کے سالے کو۔ ان کو پیغام کر۔ یہ اگلا چاند کب ہے؟"

"رئیس، ابھی آٹھ نو دن ہیں۔"

"بس پھر اگلے چاند کی پانچویں مقرر کرتے ہیں۔ میاں فضل محمد، تم لوگوں نے سن، یا باقی خانو دوسرے طرف کو خبر کر دے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاؤ رئیس، بالکل ٹھیک ہے۔" میاں فضل کے جواب سے یہ بات ختم ہوئی۔ رئیس اوطاق میں بیٹھے اور لوگوں سے حالی احوالی ہونے لگا۔

بیرل نے بھی موڑھے پر ٹیک لگالی۔ اس کو حق انصاف کا آسرا ہو گیا۔ اب اسے فیصلے کا انتظار تھا۔ وہ دن بھی آن پہنچا۔ اس دن میاں محمد فضل، بیرل، حاجی خیر محمد، چاچا دینو، علو اور گاؤں کے چار پانچ اور لوگ فیصلے پر نکلے۔ تفصیلات تمام تر کل شام برگد کے نیچے طے ہوئی تھیں۔ مدعی یعنی ماما بیرل خاموش رہے گا۔ مخالف ٹولی اگر اس پر کوئی اونچی نیچی بات کرتی ہے تب بھی وہ نہ مشتعل ہوگا نہ جواب میں برا بھلا بولے گا۔ وہ صرف تب بول سکتا ہے جب فیصلہ کرنے والا اس سے بیان لے یا براہ راست اس سے سوال کرے۔ بولنے کا سارا وزن اس کے امین میاں فضل پر تھا۔ وہ اس کی طرف سے بیان دے گا، سوال اٹھائے گا، جواب پیش کرے گا، بحث مباحثہ بھی سنبھالے گا۔ باقی چند سمجھدار سر اس لیے ساتھ ہوں گے تاکہ ان کے ساتھ ہونے سے بیرل کی شرافت اور عزت واضح ہو اور بوقت ضرورت ان سے صلاح مصلحت کی جائے۔

وہ لوگ سارے تیل سرمہ کیے، کندھے پر رومال ڈالے، صاف کپڑے پہنے، فیصلے پر ساتھ چلے۔ سب نے جوتے دوتے صاف کیے ہوئے تھے۔ علو تو اپنا جوتا کل شام شہر سے پالش والش کروا آیا تھا اس لیے پہننے کے بجائے ہاتھ میں لے کر چل رہا تھا۔ رئیس کی اوطاق کے باہر اپنے پاؤں دھو کر کندھے پر رکھے رومال سے صاف کر کے پالش شدہ جوتا پہنا۔ اوطاق پر فیصلے کا بندوبست تھا۔ اسی بڑے ہال میں رئیس کے دونوں طرف موڑھوں کی قطار تھی جس پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بیرل اور ان کی مخالف ٹولی آمنے سامنے بیٹھی۔ رئیس کے بائیں طرف قطار میں پہلا شخص ماسٹر خمیسو تھا۔ ماسٹر خمیسو رئیس علن کا دایاں ہاتھ اور عقل فہم والا شخص تھا۔ وہ اتنا قریب بیٹھا تھا کہ رئیس سے ہلکے آواز میں بات کر

سکے۔ فریقین کے پہنچنے کی تسلی کر کے ماسٹر خمیسو رئیس کی اجازت سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''سب بیٹھنے والوں کو بتایا جاتا ہے، میاں پیرل رئیس علن کے پاس چل کر آیا، اپنے کسی مامرے میں۔ اس نے حق انصاف کا فیصلہ طلب کیا رئیس سے۔ اس کا مامرا اس کی سسرال کی طرف ہے۔ رئیس کے بلاوے پر دونوں فریق آئے ہیں۔ منہ پر بات ہوگی۔ کھرے کھوٹے کی پہچان کی جائے گی۔ سچ جھوٹ کو الگ کیا جائے گا۔ پھر باتیں سن کر حق انصاف ہوگا۔ اس دوران کوئی اجازت کے بغیر بات نہ کرے۔ دونوں طرف کے امین بولیں گے۔ ایک کی بات میں دوسرے کو گھسنے کی اجازت نہیں۔ ہر ایک کو بولنے کا پورا موقع ملے گا۔ میاں پیرل، تمھارا امین کون ہے؟''

''میرا امین چاچا محمد فضل ہے۔''

''میاں سرو، تمھارا امین کون ہے؟''

''میں اپنا امین خود ہوں۔'' سرو کے لہجے میں تیزی تھی جو رئیس علن کی اوطاق پر بھی ختم نہ ہوئی تھی۔

''عزت دار کا امین بولتا ہے۔ سرخ زبان ہر جگہ دکھانے کی نہیں ہوتی۔'' ماسٹر خمیسو سرو کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمھارے ساتھ اور کون آیا ہے؟''

''یہ میرے گاؤں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہیں،'' سرو نے جواب دیا۔

''ادا ماستر، ہم رئیس کے بلاوے پر آئے ہیں، سرو نے ہمیں ساتھ آنے کا نہیں بولا!'' حبیب اللہ نے سرو کی بات رد کی۔

''میاں حبیب اللہ، میں پوچھ رہا ہوں، تم لوگ سرو کے ساتھ ہو؟''

''ادا ماستر، ہم ساتھ تب ہوں جب ہمیں کوئی عزت سے بلائے، صلاح ولاح کرے۔ ایسا کچھ ہوا نہیں۔ باقی رئیس کے بلاوے پر آنا ہماری اپنی عزت ہے۔'' حبیب اللہ کے جواب کے بعد ماسٹر خمیسو رئیس کے ساتھ سس پھس کرنے بیٹھ گیا۔

''بات یہ ہے، سرو امین ساتھ نہیں لایا، وہ اپنی طرف سے خود بولے گا۔ باقی میاں پیرل کی طرف سے اس کا امین میاں محمد فضل امانت داری کرے گا۔ فیصلے میں پہلا حق فریادی کا ہے۔ میاں فضل بات کرے۔''

''یہ کون سا انصاف ہے؟ میرے باپ کو ذلیل کیا اور فیصلہ بھی ہم پر!'' سرو میاں فضل کے پہلے بات کرنے پر تاؤ کھا کر شروع ہو گیا۔

''بند کر ڑے اپنی زبان! سنا نہیں، ہر ایک، اپنی باری پر بولے گا۔ دوبارہ بیچ میں منہ کھولا ہے نا تو تیری گاف میں یہ اپنی پوری لاٹھی گھسا دوں گا۔'' رئیس نے ساتھ پڑا عصا ہاتھ میں پکڑا اور سرو پر الٹ پڑا۔ سرو رئیس کا غصہ دیکھ کر خشک پڑ گیا۔

''مولا سائیں رئیس کی، سب آئے ہوؤں کی خیر کرے۔ دین ایمان سلامت رکھے۔ اصل بات یہ ہے کہ مٹی مائٹی میں اترائی چڑھائی آتی ہے، کیونکہ انسان ذات کی بات ہے۔ اس سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ پھر بھی چھوٹے بڑے کی پہچان ضروری ہے، اپنے پرائے کی خبر ہو۔ اس لیے آئے ہوئے کا، بڑے کا لحاظ ہوتا ہے۔ مان مریادا ہوتی ہے، زمانے میں اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اونٹھ بن جائے، ہر ایک پر جھاگ نکالتا پھرے۔ نہ عورت ذات، نہ سفید سر کا خیال۔ یہ جوان مردی نہیں۔ جواں مردی کہتے ہیں، بھلا کرنا، نیاز، عاجزی۔ ہم نے اپنے بڑوں سے بھی سنا اور زمانے سے بھی سیکھا۔ سو رئیس، اللہ آپ کو نیکی دے، بات کو ختم کرتے ہیں۔ میاں پیرل کی شادی ہے میاں قادر بخش کے گھر۔ قادر بخش سرو کا باپ تھا۔ شادی کو سال دو سال ہو گئے ہیں۔ میاں بیوی آپس میں راضی ہیں۔ میاں پیرل گھر کا خرچہ برابر دے رہا ہے۔ کسی چیز میں کمی کوتاہی نہیں۔ ہوا ایسے کہ مرحیات قادر بخش بیمار پڑ گیا۔ پیرل بیوی کو باپ سے ملانے گیا۔ باپ کا حق ہوتا ہے بیٹی پر۔ قادر بخش صفا بیمار، اصل چارپائی پر پڑا ہوا۔ بیٹی کے لیے باپ جیسے آسمان۔ اس نے شوہر سے اجازت لی کہ باپ کی خدمت چاکری کرے، اس کے ٹھیک ہونے تک وہیں رہے۔ میاں پیرل بھلا آدمی ہے۔ حالانکہ گھر عورت ذات سے چلتا ہے پھر بھی گھر بھلا کر بیوی کو وہاں رہنے دیا۔ اگر عزت دار نہ ہوتا تو کہتا، بھئی تم اپنے گھر کی کرو، باپ کی دیکھ ریکھ تیرا ذمہ نہیں۔ لیکن نہیں! عزت داری سے چلنے کا اپنا رواج ہے۔ رب کی کرنی ایسی ہوئی کہ قادر بخش بچ نہ سکا۔ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اللہ اسے جنت میں جگہ دے۔'' وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس پر آمین کہا۔ ''پیرل فوتگی میں شریک ہوا۔ تین دن تڈے پر بیٹھا۔ پھر بھی بیوی کو چالیسویں تک وہاں رہنے دیا کہ موت کا گھر ہے۔ اب پیرل چالیسویں کے بعد بیوی کو گھر لے جانے لگا تو سرو نے، جو پیرل کا سالا ہے، عزت داری کے برخلافی کر کے بیوی دینے سے انکار کیا، بلکہ بڑے

بہنوئی کو دھکے دے کر گھر سے نکالا۔ یہ طریقہ ہے رشتے داری میں چلنے کا؟'' لوگ توبہ توبہ کرنے لگے۔

''ہمارے ہاں واقفیت کا بھی ناتا ہوتا ہے، اس کا بھی پاس ہوتا ہے۔ یہ تو سینہ زوری ہے سراسر۔ حیف ہو اس بات پر۔ اب اتنی بھی اندھیر نہیں۔ پاؤ آٹا ہر ایک کھاتا ہے۔ اتنی طاقت ہر ایک میں ہے جو اپنا حق حساب کرے، اور پیرل کر سکتا تھا۔ لیکن نہیں! رشتے ناتے میں ایسے نہیں چلا جاتا۔ اور رئیس علن جیسا انصاف پسند بیٹھا ہے تو ہم زوراز وری کیوں کریں؟ سو بس یہی بات ہے کہ حق انصاف ہو۔ حق دار کو حق ملے۔ باقی سب خیر ہے۔'' میاں محمد فضل بات پوری کر کے بیٹھ گیا۔

''ہاں سرو، اب تُو جواب دے!'' ماسٹر خمیسو سرو سے بولا۔

''رئیس، اس کو شرم نہیں جو سفید سر کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ نسورو جھوٹ! بولتا ہے، حق انصاف، حق انصاف، عزت داری، عزت داری۔ یہ عزت داری تھی جب ابے کو گھر سے نکالا تھا؟''

سرو میاں فضل پر آنکھیں نکالنے لگا لیکن میاں فضل نے جواباً اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ ویسے ہی پُرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔

''اڑے اُدھر کیا بات کرتا ہے؟ اِدھر دیکھ کر بات کر!'' ماسٹر خمیسو نے سرو کو جھڑک کر کہا۔ ''تم نے سمجھا نہیں کہ آپس میں بات نہیں کرنی؟''

''سائیں ماستر، ابا گریب گیا تھا پیرل کے گھر ملنے ولنے۔ انھوں نے یہ عزت دی کہ گھر سے دھکے مار کر نکال دیا۔''

''میاں فضل، یہ کیسی بات ہے؟''

''رئیس، ایسی کوئی بھی بات نہیں۔ یہ سارے بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لو۔ تمھارے سامنے کوئی جھوٹ نہ بولے گا۔ الٹا جب مرحیات قادر بخش ناراض ہو کر جا رہا تھا تو پیرل نے اُسے روکا، منتیں کیں، مافی مانگی۔ اگر سسر کو بے عزت کر کے گھر سے نکالتا، جھگڑا کرتا تو اس کے بیمار ہونے پر سسر کے گھر طبیعت پوچھنے جاتا؟''

''بات تو صحیح ہے میاں فضل کی۔ سرو، دے جواب؟''

''گھر سے نہیں نکالا، پر بے عزتی تو کی ناں!''

نسورو: سراسر۔

''یہ اصل بات کھول میاں فضل۔ بات ہے کیا؟''

''رئیس، بات یہ ہے، مرحیات قادر بخش اور چاچے علی حیدر کی تیکھ میٹھ ہو گئی تھی۔ اس بات پر قادر بخش ناراض ہو کر چلا گیا۔ اب اس میں پیرل کا کیا قصور؟ اس نے تو اپنے سر سے مافیاں مانگیں لیکن قادر بخش ناراض ہو کر چلا گیا۔ اب دنیا جہاں کو پتا ہے، چاچا علی حیدر بوڑھا آدمی ہے، غصہ کھا جاتا ہے۔ اسے کون روکے؟''

''پر ابے کی بے عزتی تو ہوئی ناں؟''

''رئیس، چاچا علی حیدر مرحیات سے پھر بھی دو چار برس بڑا ہوگا۔ بڑے کے کہنے سننے پر غصہ نہیں کھاتے۔ اس سے آدمی کا شان کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی پیرل نے پوری مافی تلافی کی۔''

''سرو، بات میاں محمد فضل کی برابر ہے۔ پیرل کی طرف کیا حق حساب نکلتا ہے؟''

''رئیس، ابا خود روک کر گیا، پیرل کو لڑکی نہ دینا۔ اب مرے ہوے کی زبان کی عزت تو ہے ناں؟''

''اگر ایسی بات ہے تو گواہ دے اس بات کے!''

''ماستر، ابا مجھے کہہ گیا، میں گواہ کہاں سے لاؤں؟''

''ماستر سائیں، مرحیات پیرل کے گھر سے واپسی کے عرصہ بعد بیمار پڑا۔ اس عرصے وہ اٹھا بیٹھا، لوگوں سے ملا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کسی اور سے کرتا۔ کسی نے ایسی بات سنی؟ یہ حبیب اللہ چنگا مڑس بیٹھا ہے۔ اشراف عزت والا ہے۔ اس سے تو کم سے کم ایسی بات کی ہوتی۔ حبیب اللہ سامنے بیٹھا ہے، اس سے پوچھ لیں۔'' میاں فضل سرو کے سب راستے بند کرتا آیا۔

''میاں حبیب اللہ، تُو عزت والا ہے۔ تیری زبان کی قیمت ہے۔ تو اللہ واسطے گواہی دے، تم سے ایسی بات مرحیات نے کی؟'' ماسٹر خمیسو نے حبیب اللہ سے پوچھا۔

''ماستر، جانا اپنی اپنی قبر میں ہے اس لیے جھوٹ نہ بولوں گا۔ مرحیات قادر بخش نے ہم سے ایسی بات نہیں کی نہ ہم نے اس کی زبان سے ایسی بات سنی۔''

''سرو، سن! اگر تیرے باپ کا ایسا ارادہ ہوتا تو وہ چنگے مڑس سے صلاح ولاح کرتا یا تجھ سے کرتا؟''

''رئیس، یہ رشتہ بھی جب مرحیات نے کیا تھا تو اس کے لیے میاں حبیب اللہ کو بھیجا تھا۔ اس نے ساری بات وات، معاملہ وامله طے کیا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو حبیب اللہ کو کیسے خبر نہ ہوتی؟'' اس بات کے بعد ماسٹر خمیسو کو رئیس علن نے اپنے کان کے قریب بلایا اور وہ آپس میں بولنے لگے۔ کچھ دیر بعد رئیس علن خان اٹھ کھڑا ہوا۔

''ادا، فیصلہ تم لوگوں نے بھی سنا۔ منھ پر سب باتیں ہوئیں۔ چالیس پچاس لوگ بیٹھے سن رہے ہیں۔ انصاف یہ کہتا ہے، سرو کو کوئی حق نہیں کہ وہ پیرل کی بیوی روک لے۔ پیرل کی طرف کوئی حق حساب نہیں نکلتا۔ مرحیات قادر بخش اگر ناراض ہو کر گیا تو وہ علی حیدر کی باتوں پر غصہ کھا کر گیا۔ اس میں پیرل کا قصور؟ پیرل اپنے سے باپ کی عمر والے پر جا کھڑا ہو؟ اس کی بے عزتی کرے؟ اگر علی حیدر کی بات پر مرحیات کو کوئی تکلیف ہوتی، کوئی حق حساب لینا ہوتا تو ہمارے پاس فیصلے کے لیے نہیں آتا؟ چلو ہمارے پاس نہیں تو کم سے کم اپنے چنگے مڑس حبیب اللہ سے بات تو کرتا۔ ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے، مرحیات بھی بڑے کی عزت کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ اب جب وہ فیصلہ لینے نہیں آیا، اس نے پیرل پر فیصلہ نہیں لیا، اعتراض نہیں کیا، تو سرو کون ہوتا ہے پیرل کی بیوی روکنے والا؟ اور یہ کوئی فضیلت کی بات ہے کسی کے ننگ کو روک لینا؟ ہاں؟'' اب رئیس سیدھا سرو سے مخاطب ہوا۔ ''آج کے آج پیرل کی بیوی واپس کرا اور اگر پیرل دعویٰ کرے تو تجھ پر جرمانہ بھی کریں گے۔ کیا کہتے ہو پیرل؟'' رئیس کی بات پر پیرل اور گاؤں والے سر جوڑ کر اکٹھا ہوئے۔ اس دوران سرو کا سر جھک گیا تھا۔

''رئیس، برابر سرو کی طرف حق حساب نکلتا ہے، پر پیرل والوں سے میری گزارش ہے کہ بات ختم کر کے آپس میں بن جائیں۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے، سرو سے غلطی ہوئی ہے، پر پیرل بڑا ہے۔ وہ چھوٹے کو معاف کر دے تو آپس میں رشتے داری رہ جائے گی۔'' اسی دوران حبیب اللہ کھڑا ہو کر بات کرنے لگا۔

''میاں محمد فضل، بات حبیب اللہ نے دل والی کی ہے۔ برابر سرو قصوروار ہے، پر رشتہ تعلق بھی بڑی بات ہے۔''

''رئیس، جیسے آپ کہیں، ہمیں قبول ہے۔''

''اٹھ سرو، تُو آگے بڑھ کر پیرل سے مل اور مافی مانگ۔ وہ بڑا ہے تیرا۔ جھک کر مل!'' رئیس کی

آواز پر سرو عمل کرتا گیا۔ باوجود اس کے کہ اس کا اندر کھول رہا تھا مگر رئیس علن کی طاقت سے وہ واقف تھا۔ ''پیرل، تو بھی سرو کو ماف کر دے۔ چھوٹا ہے تیرا۔'' پیرل نے جھکتے سرو کو بازوؤں میں لے کر گلے سے لگا یا۔

''رئیس، سرو اپنا ہے۔ میرے اندر کوئی گیر (غیر) نہیں۔ ادا سرو، میں نے تجھے ماف کیا۔''

اگلے دن پیرل بیوی کو لے آیا۔ وہ اتنا خوش تھا جیسے یہ شادی کا دن ہو۔ من تتلی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ قفل زدہ کیفیت کی زنگ آلود کنڈی کھل چکی تھی۔ پچھلے دن تو جیسے قبر اندر گزرے تھے۔ ان کے اثرات کے تحت اب بھی کسی وقت اپنے آپ کو یقین دلانے گھر جا نکلتا، پھر بیوی کو دیکھ کر اسے قرار آجاتا۔ وہ خوش خوش لوگوں سے چُہلیں کرتا واپس کام پر آتا۔ اس کا لکڑی چھیلنے والا رندہ اور ہلکا ہو گیا تھا۔ لکڑی کی پرت آپے آپ چھیلتی جاتی اور لکڑی یوں ایسی چکنی ہو جاتی کہ سنگ مرمر کا گماں ہوتا۔ بچوں کے ساتھ مستی عروج پر اور ماما کے دھماکے بھی خوب چلتے تھے۔ اب وہ اتنے زور سے پاد مارتا کہ موجود لوگوں کو کچرا باہر نکل آنے کا اندیشہ ہونے لگتا۔ علو تو ایسے وقت پر ماما کی دھوتی اٹھا کر جھانکنے لگتا۔ زندگی سندھو ندی جیسے بہاؤ میں بہنے لگی تھی۔ بس ایک چیز ماما پیرل کو پریشان رکھتی، جو تھیں چاچے علی حیدر کی باتیں۔ وہ جہاں پیرل کو پاتا، اسے نہ بخشتا۔

''ہاں سائیں، مونچھوں کو مکھن پلا! بڑا تیر مار کے آیا ہے۔ ڈوب کے نہیں مرتا؟ میں نے حیاتی میں تیرے جیسا مرد نہیں دیکھا جو عورت کے پیچھے عورت بنا ہوا ہے۔ روتا پھر رہا ہے۔ رئیس علن کے پاس فیصلہ لے گیا ہے۔ انھوں نے بٹھا دی تھی تو بٹھائے رکھتے، کیوں لے آیا جا کر؟ طلاق نہیں ماری ان کے منھ پر؟ بیوی انھوں نے رکھ دی تھی تو تجھے عورتوں کی کمی تھی؟ اور شادی کر لیتا۔ ایسے بے گیرتوں میں شادی کی جو اپنے بیٹی کے گھر آ کر کھانا پینا کریں، پھر وہ گیرتی بیٹے بن گئے جو لڑکی گھر بٹھا دی۔ اور تو ایسا بے گیرت بن گیا جوان کے در پر جا کے پڑ گیا۔ یہی تو اثر ہوتا ہے گیرتی اور بے گیرتی میں شادی کرنے کا۔ تجھے بھی بے گیرت بنا دیا۔ لکھ لعنت ہو تجھ پر! مرد کا میم بھی نہیں تجھ میں۔ ایسا کر، اب بیوی کو اپنی جگہ بٹھا اور خود اس کی ہانڈی سنبھال لے۔''

چاچے علی حیدر کی باتوں پر پیرل کا اندر کھولنے لگتا مگر بیر مرد کے آگے کوئی بولے کیا؟ اس کو چپ

پا کر چاچا علی حیدر پھر الف سے ابتدا کرتا اور اول فول بولتا رہتا۔ آخر میں پیرل خود یہاں وہاں ہو جائے تو ٹھیک، ورنہ چاچا کی چابی بند نہ ہوتی۔ ”کچھ اور نہیں ہوتا تو یہ مونچھ منڈوا۔ اپنی نہیں تو ان مونچھوں کی عزت کا خیال کر۔“ پیرل کے اندر سے دھواں اٹھنے لگتا مگر علاج اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ چاچے علی حیدر کی جھک جھک کے سب عادی تھے۔ گاؤں کیا، پورے علاقے میں اسے ایسا لائسنس ملا ہوا تھا۔ اس لیے پیرل برداشت کرتا رہا کہ چاچے کا دھیان کسی اور طرف ہو جائے مگر چاچا بات بھلانے کو تیار نہ تھا۔ جہاں پیرل کو دیکھتا، پھوٹ پڑتا۔ آہستہ آہستہ پیرل میں جھنجھلاہٹ بڑھنے لگی۔ مہینہ دو مہینہ گزر گیا۔ اب پیرل کو کسی وقت ایسا غصہ گھیرتا کہ اسے اپنا قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اس بات کے اندر یہ بات بھی تھی کہ چاچا علی حیدر کسی کو لتاڑتا، سات سُر سناتا تو وہاں بیٹھے قہقہے مارنے لگتے، چاچے علی حیدر کو اس کی پگڑی اتارنے کے لیے اور اکساتے۔ مگر پیرل کی باری سارے چپ سادھ لیتے، انھیں جیسے سانپ سونگھ جاتا۔ اب پیرل کو خوف ہونے لگا کہ کسی وقت چاچے علی حیدر کو ایسا جواب نہ دے ڈالے کہ پورے علاقے میں اس کی بدنامی ہو جائے کہ پیرل نے اپنے سے بڑے کی عزت نہیں رکھی۔ اوپر سے بیوی الگ تکرار کرنے لگی۔ باپ کی موت اور بھائی کی آنکھ دیکھ کر وہ وہمی ہو گئی تھی۔ اولاد میں دیر اب اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ملا رحیم داد کے دم کردہ زچھوارے، نہار منھ دیسی انڈا، سات کالی مرچ اور دیسی اجوائن کی پھکی بھی کر کے دیکھ لیے مگر کچھ بھی اثر نہیں دکھا رہا تھا۔ آثار ویسے ہی تھے۔ ہر ماہ دن وہ ٹوٹکے کرتی، امید چڑھانے لگتی، مگر جب دن آجاتے تو سر پر پٹی باندھ کر پڑ جاتی۔ اب اس کے سامنے سائیں بخشت شاہ بادشاہ کے پاس چوک گزارنے کے سوا کوئی حیلہ نہ بچا تھا۔

”تجھے میری اولاد نہ ہونے کا کیا گم (غم)؟ تیری تو اولاد ہے۔ ہو نہ ہو، تیرا کیا جاتا ہے!“ وہ اس دن تکرار کرتے جملہ نکال بیٹھی۔

”اڑے دلڑی، ایسی بات نہیں۔ تو فکر ہی نہ کر۔ جلد چلیں گے۔“

”میں اب اپنا فکر نہ کروں تو اور کون کرے گا؟ باپ تھا وہ چلا گیا، بھائی میرا آنکھیں بدلے بیٹھا ہے۔ میرا اب اس جہان میں ہے ہی کون؟“ وہ روتی چلی گئی۔

”اڑے میں نہیں ہوں کیا؟ میرے ہوتے تو گم میں پڑتی ہے چری!“

”لے کے مجھے سائیں بخشت شاہ بادشاہ کے پاس نہیں جاتا، اور تیرے ہوتے۔“

''اڑے کیوں نہیں لے جاؤں گا؟ چلیں گے، چلیں گے۔ تو تھوڑا گوشت تو چڑھا لے ہڈیوں پر۔ دیکھ کیسے ضعیفڑی ہو گئی ہے۔''

''درد نے مجھے مار ڈالا ہے۔ میں بتاؤں تو کسے؟ سگا کوئی رہا نہیں۔ ایک مُرس کا آسرا تھا جسے میری پرواہ ہی نہیں۔ دل کرتا ہے جنگل کو منھ کر کے نکل جاؤں،'' بیوی دانت بھینچ کر بولتی گئی۔ اس کے الفاظ سن کر بیرل دہل گیا۔ اس نے بیوی کو بازوؤں میں لینا چاہا مگر وہ سسکیاں لیتی کمرے سے نکل گئی۔ بیرل کا دل کسی نے پاؤں کے نیچے دے دیا۔ اس نے اپنی سائیکل اٹھائی اور عاشق دکاندار کے پاس جا نکلا۔

''اے بیرل، خوش خیر؟ بے وقت کیسے آنکلا تُو؟''

''بس یار، میں نے کہا سامان وامان لے آؤں۔''

''یار، سامان تو تُو صبح لے گیا تھا۔''

''ہاؤ یار! پھر پتا نہیں میں کیوں آیا۔ ہاں یار، بات یہ ہے سائیں بخشث شاہ بادشاہ پر تیاری ہے، کچھ رقم چاہیے تھی۔''

''یار، رقم تو تیری ساری میرے پاس پڑی ہے۔ بتا چاہیے کتنی؟''

''یار، بس کچھ روپے دے دے۔ پتا نہیں کتنا خرچ ہو۔''

''یار، تیرے تو میرے پاس ہزار دو ہزار ہو گئے ہیں۔ جتنے کہے اتنے دوں۔''

''یار بس ایسے ہی خرچ ورچ کے لیے دے دے۔''

''یہ رکھ لے۔'' عاشق اسے پیسے تھما کر کاپی میں لکھنے لگا۔ بیرل نے پیسے گننے کے بجائے دھوتی میں اُڑس لیے۔ ''یار، صفا حد کرتے ہو! گن تو سہی۔''

''یار، یہ گننے ونے کے چکر میں کیا پڑیں۔ تم باقی کس کام کے لیے ہو؟''

''یار، بھلا بات بتا، اتنے پیسے ویسے جمع کر کے کرے گا کیا؟''

''یار، بات ہے یہ کہ بیوی کو نتھ بھی نہیں دی تھی شادی پر۔ اب کٹھے کر رہا ہوں کہ دو چار پیسے جمع ہو جائیں تو اس کے لیے سونا وونا لوں۔ اور بیٹی کی شادی کے دن بھی اوپر آنے لگے ہیں۔''

''اچھا اچھا۔ میں سوچ رہا تھا، اتنے جمع کر رہا ہے، کوئی پھنٹی لے گا۔''

"اڑے خود لے یہ پھینپھٹی! ہمارے لیے ہے یہ گالی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ بوڑھا ہوگیا، طاقت چھوڑ گئی ہے جو پھینپھٹی پر چل رہا ہے۔ سمجھے؟"

اگلا دن تیاری کا تھا۔ بیوی نے کپڑے لتے دھوئے، پیرل گاؤں سے پتن تک تانگہ کروا آیا۔ صبح صبح اٹھ کر بیوی نے مکھن میں تر بتر روٹیاں ڈالیں۔ ان کے اندر اچار کی پھانکیں رکھ کر پوٹلی میں باندھ لیا۔ تانگے پر چڑھ کر وہ روانہ ہوئے۔ پیرل کا چھوٹا بیٹا بھی ساتھ تھا۔ پیرل پہران اور چار خانے والی لنگی پہنے تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہاں چوک رہنے کے لیے رلیاں، کپڑے، سامان کی دو گٹھڑیاں اس کے پاؤں میں رکھی تھیں۔ پچھلی سیٹ پر بیوی اور بیٹا فرید بیٹھے تھے۔ گاؤں سے شہر، پھر شہر سے بند تک پہنچتے انھیں کافی وقت لگا۔ بند پر چڑھ کر تانگے والے نے انھیں اتارا۔ نو دس فٹ بلند یہ بچاؤ بند دریائے سندھ کی آخری سرحد کا پہریدار تھا۔ اس بند سے لے کر دوسرے چھوڑ والے بند تک کئی میل کی چوڑائی میں دریا شاہ کی حکومت تھی جسے کچے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس علاقے کے اندر دریا بادشاہ اپنی موج مرضی سے بہتا ہے، کبھی اِس کروٹ تو کبھی اُس کروٹ۔ جب وہ کروٹ بدلنا شروع کرتا ہے تو اسے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ وہ ہر سال اسی کروٹ بدلتا بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بند سے متھا لگاتا ہے۔ پھر کچھ سال تک وہ بیل کی مانند بند سے سینگ اڑکائے زور کرتا رہتا ہے۔ انھی سالوں میں دریا کے اندر آ جانے والے اپنا پورا گاؤں اٹھا کر اُس پار جا بیٹھتے اور اس زمین کو آباد کرنا شروع کرتے جو تازہ تازہ دریا کے چنگل سے آزاد ہوئی ہے۔ یہ زمین بلا کی طاقتور۔ بوئی ہوئی فصل اس میں سے دبے خزانے کی طرح نکل پڑتی ہے۔

پیرل بیٹے بیوی کو ساتھ لیے بند سے نیچے کچے کی طرف اترا۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں ایک چھپر تھا جس کے بازو پانی کا نلکا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ پانی وانی کر کے چھپر کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہ ایسے راہرو کے انتظار میں تھے جو آگے جاتا ہو، کیونکہ آگے جنگل کھڑا تھا جس کے اندر راہ سے انجان کے لیے راستہ پانا ناممکن تھا۔ ناواقف اگر خود سے جنگل میں اترے تو خود کو بھول بیٹھے۔ آنے جانے والے لوگ اپنی یادداشت اور علامتوں پر بھروسا کر کے چلتے۔ اِن دنوں تو دریا بادشاہ اِس کروٹ تھا تو ان کو کئی میل پیدل سفر کرنا تھا۔ پیرل اور اس کی بیوی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ انھیں زیادہ فکرمندی نہ تھی۔ راستہ

آباد تھا۔ جلد ہی کوئی آتا جاتا دریا پار کرنے والا آ جاتا تھا۔ بیوی سائیں بخشٹ شاہ بادشاہ پر جاتے خوشی سے سما نہیں رہی تھی۔ اسے امید کے پورے ہونے کا یقین تھا۔ چھوٹا لڑکا زمین پر بیٹھے لکڑی سے لکیریں کھینچنے لگا۔ اس سے اکتایا تو درختوں کی جھکی شاخوں میں چمٹ کر جھولے لینے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک درخت کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا۔ باپ نے آواز دی۔ وہ اتر آیا۔ تینوں اچار روٹی کھانے لگے۔ ماحول میں ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کے چہچہانے کے ساتھ ان کے ہلتے جبڑوں سے چپڑ چپڑ کی آواز شامل ہونے لگی۔ اچار ختم ہوا تو وہ بچی روٹی کے بڑے نوالے نگلنے لگے۔ کھانا کھانے کے بعد بیرل کو کچھ وزن محسوس ہوا۔ وہ ایک طرف جنگل میں پیٹ خالی کرنے اتر گیا۔ اتنی دیر میں بند سے دو بندے اترتے آئے۔ ایک نے مہندی رنگ کی قمیص پہنی تھی جس کے گریبان کے سارے بٹن کھلے تھے۔ دوسرا بڑی عمر والا سفید سر کے ساتھ آگے آگے چلتا آ رہا تھا۔ بیوی نے اجنبی دیکھ کے منہ پرے کر لیا۔

''چھوٹے، ان کو کہو رک جائیں۔ تیرا باپ آئے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔'' چھوٹا یہ بات سن کر ان کی طرف دوڑا۔

''ٹھیرو چاچا ٹھیرو۔ ہم بھی چلیں گے۔ بابا خیال سے گیا ہے۔''

''ہاؤ پٹ، ہاؤ۔'' بیر مرد نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دونوں نلکے سے ہاتھ منہ دھو کر الگ ہو کے بیٹھ گئے۔ بیرل آیا۔ خوش خیری ہوئی۔ سب مل کر قطار میں جانے لگے۔ سامان کی ایک گٹھڑی بیرل نے اٹھائی، دوسری کھلے گریبان والے نے سنبھال لی۔ پتلی ریتلی پگڈنڈی پر جھاڑیوں کانٹوں سے بچتے وہ چلتے گئے۔ ان کے اوپر درختوں کا سایہ تھا۔ آگے جا کر وہ واہڑ میں اترے۔ یہ واہڑ اونٹھ ڈباؤ قد جتنا قدرتی کٹاؤ تھا جو پانی کے چڑھاؤ یا سیلاب کے وقت پانی سے تارو تار ہو کر ایک نہر بن جاتا تھا۔ واہڑ کے پیٹ میں چلنا قدرے آسان تھا۔

''ادا، پار جا رہے ہو؟'' بیر مرد بیرل سے پوچھنے لگا۔

''ہاؤ ادا، پار جا رہے ہیں۔''

''اپنوں کے پاس جاتے ہو گے؟''

''نہیں ادا۔ سائیں بخشٹ شاہ بادشاہ کے پاس چوک رہنے جا رہے ہیں۔''

پٹ: بیٹا، پوت۔

''سائیں بڑی طاقت والا ہے! بڑی کرامت ہے سائیں کی!''

''ہاؤ ادا، سائیں کی بادشاہی ہے۔''

''ادا، میں تو سائیں بادشاہ کے سائے میں رہتا ہوں۔ ہماری تو آنکھوں دیکھی بات ہے جب سائیں نے ظہور کیا تھا۔ ہوا ایسے تھا، ہمارے گوٹھ کے ساتھ قبرستان ہے۔ اصل صفا پرانا ہے۔ ہمارے بڑے بتاتے تھے، انھیں بھی پتا نہیں کہ کون کون سی ہستی یہاں دفن ہے۔ جب دریا چڑھ آیا تھا، میں جوان تھا تب، دریا سارا قبرستان بہا گیا۔ تب سائیں بخشت شاہ بادشاہ کی ذات پانی پر ظاہر ہوئی۔ کفن میں لپٹی مگر ایسے صاف جسم جیسے پھول۔ پورا جسم صحیح سلامت۔ منھ ایسا چمک رہا تھا جیسے سو دیے جل رہے تھے۔ ادا، نور کی قسم، میں نے اپنی آنکھوں سے دیدار کیا تھا۔ پھر لوگوں کو سمجھ آئی کہ دریا سائیں کو سلامی ہونے آیا تھا۔ لوگ آکر ایسے ٹوٹے جو کیا بتاؤں۔ ایک بوڑھی تھی۔ چلنے سے صفا ہلاک۔ پچاس میل سے اٹھا کر لائے تھے۔ سائیں کی وہ کرامت ہوئی کہ اسے اٹھا کر لائے تھے، وہ اپنے پاؤں پر چل کر گئی۔ سائیں کی بڑی پہنچ ہے۔ ایک اور بات سنو۔ ایک آدمی آیا تھا تمھارے طرف سے۔ اس کی انکھیں آنکھوں جیسی، مگر نظر تھی ہی نہیں۔ بالکل ختم ہو گئی۔ سائیں کی مزار سے خاک شفا جو ڈالی تو آنکھیں روشن ہو گئیں۔ بس ادا، بڑی بات ہے سائیں کی۔ کیا کیا سناؤں۔''

''برابر، ادا۔ اس لیے تو ہم چلے ہیں۔ میری بیوی ہے۔ اس کو اولاد کا ارمان ہے۔ سائیں خالی نہ لوٹائے گا۔''

''ادا، تو فکر نہ کر۔ خالی جھولی بھر کر واپس لوٹو گے۔ دیکھنا تم خود۔''

بیوی کو پیر مرد کی بات نے راحت پہنچائی۔ اب وہ چلتے ہوئے جنگل سے نکل کر کاشت کردہ زمینوں کے درمیان پہنچے تھے۔ سفر ابھی باقی تھا۔ سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ گرمی ہو گئی تھی۔ کھیتوں کے آگے پھر تھوڑے سے درخت کھڑے تھے۔ وہ درختوں سے نکلے تو سامنے چمکتی ریت کی سلطنت تھی جو اترائی میں کھسک کر دریا کنارے سے ملتی تھی۔ پانی ہی پانی۔ نظر کے اختتام پر بھی پانی موجود۔ دوسرے کنارے کا بس شائبہ ہوتا تھا۔ پانی کی ہیبت سے بیرل کی بیوی پر ڈر بیٹھ گیا۔ کنارے پر اور بھی مرد عورتیں تھیں۔ عورتیں اس جھگی کے اندر سائے میں بیٹھی تھیں جو میر بحروں کے لیے رات کی جائے پناہ تھی۔ مرد اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ کچھ نے بکریوں کی رسیاں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔ بیرل

کنارے پر بیٹھ گیا۔ اب کشتی کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا، جس وقت آئے سو آئے۔ دیر بعد ایک دھبا پانی پر نظر آنے لگا۔ اس نے پھر کشتی کی شکل بنالی۔ دو ملاح چپوسے کشتی کھیتے آئے۔ کنارے کے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک نے لمبا بانس اٹھایا اور پانی کے اندر بانس گاڑتے کشتی کی رفتار روکنے لگا۔ آخر کار بانس کنارے پر دھنسا، کشتی رکی۔ کشتی کو پہلو بھر کر کے انھوں نے ایک تختہ کشتی کی لگار اور کنارے پر جمایا۔ کشتی میں بیٹھے لوگ اترنے لگے۔ کشتی خالی ہوئی اور پھر دم کے دم میں بھر گئی۔ عورتیں کشتی کے اگلے حصے میں اور مرد پیچھے اور درمیان۔ بیچ میں بکریاں وغیرہ بھی کھڑی کر دی گئیں۔ کشتی نے شمال کا رخ کیا اور، چپوؤں کے زور پر ڈولتی، چلنے لگی۔ ہوا بند تھی۔ کشتی کا سرخ پیندا پانی کو کاٹنے لگا۔ پانی کے بے انت پھیلاؤ کو حقیر کشتی پاٹنے لگی۔ دوسرے کنارے کھڑے درختوں کا جمگھٹا کسی بونے کی طرح لگ رہا تھا۔

سائیں بخشت شاہ بادشاہ پر رہتے انھیں تین راتیں پڑ چکی تھیں۔ باقی چوک کی ایک رات تھی۔ کل ان کی واپسی کا دن تھا مگر سلیمت پریشان تھی کہ ابھی اسے کوئی اشارہ نہیں ہوا تھا۔ یہ تین دن اس نے مزار کی پائینتی پر گڑگڑاتے گزارے تھے۔ سائیں بخشت شاہ کے قبرستان میں جو تین چار فقیر بیٹھتے تھے وہ ان میں سے ایک ایک کے پاس حاضری دے کر دعا دم کروا چکی تھی۔ ایک ملنگنی جس کا آستان قبرستان کی مشرق طرف تھا، اس سے سرخ دھاگا پڑھوا کر اپنے آپ کو اور شوہر کو بندھوا چکی تھی۔ اب صرف اشارے کا انتظار تھا۔ وہ اس وقت مزار کی پائینتی پر سر رکھے، دل ہی دل میں بیٹے کی اولاد کے لیے پکارے جا رہی تھی۔ مزار کے اردگرد مرد عورتیں اپنی اپنی حاجت کے لیے جمع تھے۔ مزار کے اوپر گنبد نہ تھا، چار پایوں پر چھت قائم تھی۔ مزار قبرستان کے بالکل مغرب میں تھی۔ باقی قبرستان کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا۔ آنے والے انھی قبروں کے بیچ درختوں کے نیچے رلیاں بچھائے قیام کیے ہوئے تھے۔ قبرستان کے مشرق اور جنوب میں کھیت کھڑے تھے۔ شمال میں گاؤں تھا جس کے آگے قبرستان کی حد پر چند دکانیں تھیں۔ دکانوں پر مزار پر ڈالنے والی چادریں، سوکھا میوہ، پراندے، پلاسٹک کے کھلونے، جھمکے، زرق برق چوڑیاں اور میٹھی ٹافیاں ملتی تھیں۔ ایک چھپر ہوٹل بھی موجود تھا جس پر آلو شوربہ اور روٹی ملتی تھی۔ پیرل اس وقت ملنگنی کے آستانے کے نزدیک درخت کے نیچے پوٹلی پر سر رکھے

رلی پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ اس کے گرد بے ترتیب قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے وقت کسی نے دو دیگ پلاؤ خیرات بانٹی تھی، اچھے گوشت والی دو پلیٹیں کھا کر لیٹا ہوا پیرل اس خمار میں تھا۔ مزار پر جاتے ہوئے بیوی نے ساتھ چلنے کا بھی بولا مگر سستی کے مارے اس سے اٹھا نہیں گیا۔ بیوی چھوٹا ساتھ کر کے خود ہی چلی گئی۔

''ادا، سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟''

پیرل نے آواز پر مندی آنکھیں کھولیں۔ کوئی اوپر کھڑا تھا۔ سر پر چار خانے والا رومال رکھے کوئی بھولے بھالے منہ والا سانولا شخص کھڑا تھا۔

''ادا، جاگ رہا ہوں۔''

''بس ادا، ہم بھی سائیں بخشت شاہ بادشاہ کے پاس آئے ہیں۔'' وہ رلی کے کنارے بیٹھ گیا۔

''ہاؤ ادا، سائیں کے پاس ساری دنیا آ رہی ہے۔'' پیرل نے تین دن کا ماجرا بیان کیا۔

''ہاؤ سائیں، برابر۔ ادا، خود کون؟'' آنے والے نے تعارف پوچھا۔

''ادا، میں...'' پیرل نے اپنی ذات بتائی۔

''کہاں سے ہو ادا؟''

پیرل نے جواب میں اپنا علاقہ بتایا۔

''ہاں ادا، وہاں سے ہو؟ بھلا فلانے کو پہچانتے ہو؟'' اس نے ایک نام لے کر سوال کیا۔

''نہ ادا۔ میں نے یہ نام نہیں سنا۔''

''ہاں؟ بھلا فلاں کو؟ اس کو تو پکے سے جانتے ہو گے؟''

''نہ یار۔ مجھے نہیں خبر اس کی۔''

''یار، پھر تم اس جگہ رہتے ہو یا کسی اور جگہ؟ کسی کو پہچانتے ہی نہیں!''

''ادا، ہم اپنے گوٹھ... میں رہتے ہیں۔ تم جن کا نام لے رہے ہو وہ کسی اور گوٹھ کے ہوں گے۔ ہمارے گوٹھ شہر میں اس نام ذات کا کوئی بندہ میں نہیں جانتا۔''

''ہاؤ ادا، ایسے بھی ہو جاتا ہے، برابر۔ لیکن یار بڑی دور سے آئے ہو۔ آفرین ہو!''

''ادا، سائیں کے پاس حاجت لے کر آئے ہیں۔ دوسری بیوی ہے۔ اولاد نہیں ہوئی اس کو۔''

''اتنی دور سے چلے ہو، سائیں کوئی ایسے خالی جانے دے گا کیا؟ بھلا اشارہ ہوا ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں ہوا۔ بس ہو جائے گا۔''

''کون سا دن ہے تمھیں؟''

''تیسرا دن ہے ادا۔''

''بس پھر آج ہو گا ہی ہو گا۔ میں خود دس کوس سے آیا ہوں۔ بکرا پہنچانا تھا سائیں پر۔ ابے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی سو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ یہاں ایک آدمی باندھتا ہے۔ اس سے بندھوا کر سائیں پر دعا کر کے گئے تھے، ایسی ٹانگ لگی ہے جو کیا بتاؤں۔''

''واہ وا ادا! باپ کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی، اور کیا چاہیے۔''

''ہاؤ ادا، اسی لیے ابے نے بھیجا، حکیم کو شہد کا شیشہ دے آؤ اور سائیں پر بکرا پہنچا کر آؤ۔ ابھی پہنچا کر واپس جا رہا تھا تو تم پر نظر پڑ گئی۔ میں نے کہا، بھاؤ کے ساتھ کچہری کرتے ہیں۔''

''ہاؤ ادا۔ بس میری بیوی بھی گئی ہے زیارت پر۔ آتی ہو گی۔''

''پھر ادا، میں چلتا ہوں۔ کبھی آنا ہو ہمارے شہر تو میرا گھر گڑ منڈی کے ساتھ ہے۔ ضرور آنا۔''

وہ آدمی اٹھا تو پیرل اس کے پیچھے بیوی کی طرف نکلا۔ وہ چھوٹے کے ساتھ اِدھر ہی واپس آ رہی تھی۔

''لوگوں کی بڑی مرادیں پوری ہو رہی ہیں یہاں۔''

''ہماری بھی ہو گی دیکھنا۔''

''ہاں بس آج آخری رات ہے۔ اشارہ ملے تو کل واپس ہوں۔''

''آج چوتھی رات ہے۔ جیجی (ملنگنی) کہہ رہی تھی، آج پک سے ہو گا،'' بیوی نے یقین سے بولا۔

اسی رات اشارہ ہو گیا۔ بیوی نے اسی وقت پیرل کو جگایا۔

''اشارہ ہوا ہے۔ چل، جیجی کو بتائیں!''

پیرل کی آنکھوں سے نیند بھاگ گئی۔ وہ بیوی کے پیچھے پیچھے ملنگنی کے آستان پر آیا۔ ملنگنی میلی کچیلی پیوند لگی گدڑی اوپر ڈالے سو رہی تھی۔

''جیجی، اٹھواٹھو۔ اشارہ ہوگیا۔'' بیوی نے سیدھا جا کر اسے اٹھادیا۔ ملنگنی اٹھی تو اس کے گلے پڑی مالائیں بج اٹھیں۔

''دور کر اس موئے مرد کو! میرا سر ڈھانپا نہیں ہوا اور یہ آ کے بیٹھا ہے،'' ملنگنی چڑ کر بولی۔

''معافی جیجی، معافی! تو اٹھ کر جا۔'' پیرل اٹھ کر دور ہوگیا۔

''اِس وقت جا۔ رات کو گیبات ہوتی ہیں۔ سن لیں تو تمھارا کام گیا۔ جا۔ سورج نکلے، پھر آنا۔''

بیوی پر بات ایسی چھائی کہ وہ لب سی کر چلی گئی۔ واپس اپنی جگہ رلی اوپر لے کر لیٹ گئی۔

''کیا کہا جیجی نے؟'' پیرل نے اسے جھنجھوڑا۔ سلیمت نے اسے جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ دیا۔ وہ شکر کر رہی تھی، شوہر کو اشارہ بتایا نہیں ورنہ اس کا سارا کام بگڑ جاتا۔ اس کو غیبات سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ وہ شوہر سے جڑ کر لیٹ گئی۔ پیرل کو کھوج لگی ہوئی تھی۔ وہ بار بار کروٹ بدل کر بیوی سے پوچھتا۔ سلیمت اسے جواب میں ''شش'' کہہ کر خاموش کرواتی۔ سورج چڑھا، اچھا خاصا آدمی جتنا۔ بیوی ملنگنی کے پاس پہنچ گئی۔

''شکر کر تو بچ گئی ورنہ تیری کئی کمائی چلی جاتی۔ سائیں کے پاس ساری رات حاضری چلتی ہے گیبات کی۔ اگر کوئی شریر اشارہ سن لیتا تو تیرا کام گیا تھا۔ دعا دے مجھے جو تجھے بچالیا۔''

''جیجی، ہم جنگلی۔ ہمیں کیا پتا۔''

''چل اِدھر آ۔ اس دائرے میں اندر آ۔ یہ دستگیر کا دائرہ ہے۔ اس میں اشارے کی بات کی جاتی ہے۔ اب بتا، کیا دیکھا؟'' ملنگنی نے ہاتھ سے دائرہ بنایا اور سلیمت کو ہاتھ سے پکڑ کر اس کے اندر کھینچا۔

''جیجی، میں نے دیکھا، ایک کالا سانپ پھن اٹھا کر میری طرف آرہا ہے۔ میں سائیں کو آواز دینے لگی: مرشد پہنچ! میری جان بچا۔ تب وہ سانپ میرے قریب آ کر گول مول ہو کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔''

''تیرا کام ہوگیا۔ سائیں نے سن لی تیری۔ اب تُو جا۔ تجھے بیٹا ملے گا۔ پر یاد رکھ، دو چاند ریشم کے کپڑے مت پہننا، چکنی مٹی سے نہانا، ہر دوسرے دن مکھن کھانا، موتی فوتی پر مت جانا۔ اب واپس جا۔ بیٹا ہو تو سائیں کے نام کا بکرا لے آنا۔ اپنا حصہ دیتی جا۔''

گیبات (غیبات): جن بھوت۔

بیوی اٹھی۔ دائرے سے نکل کر شوہر سے رقم لی اور ملنگنی کے حوالے کی۔

''مُرس کو یہ بات یہاں مت کہنا۔ دور جا کر پھر کان میں بتانا۔ سائیں کو سلام کر کے واپس چلی جا۔ جا تیرا بیڑا پار۔''

سلیمت نے ملنگنی کا ہاتھ چوما، ملنگنی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ وہ سامان کو گٹھڑی میں باندھنے لگے۔ سائیں کی چوکھٹ چوم کر واپس روانہ ہو گئے۔ پیرل کو کھد بد ہو رہی تھی مگر بیوی ''ابھی ٹھیر!'' کے اشارے دیے جا رہی تھی۔ جب قبرستان سے کوس بھر دور ہوئے تو اس نے شوہر کو کان میں ساری بات سنائی۔

''بڑے بھاگ کھل گئے تمھارے۔ تمھارا تو سارا کام ہو گیا۔ اور کیا چاہیے تجھے۔''

''ہاں سائیں کی مہربانی ہے، خالی واپس نہ کیا۔''

وہ پتن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی چرخ چوں کی آواز نکالتی آئی۔ وہ بھی دریا کی طرف پلالی لینے خالی جا رہی تھی۔ بیل گاڑی والے نے گاڑی پر بٹھا لیا۔ پتن کے نزدیک ہوئے تو ڈھول کی تھاپ سنائی دینے لگی۔ اب پتن بس درختوں کی اوٹ میں تھا۔ ان تک سہرے گانے کی آواز پہنچنے لگی۔ پتن پر بارات کشتی کے انتظار میں تھی۔ عورتیں، بچے اور مرد رنگین کپڑے پہنے پار جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سفید داڑھی والا ڈھوکچی ڈھول گلے میں لٹکائے دو ڈنکوں سے دھا دھم پیٹے جا رہا تھا۔ ایک پتلا لڑکا ٹوتری سے سُر نکال رہا تھا۔ اس کی گردن سے رگیں ابلی آ رہی تھیں۔ ڈھول اور توتری والے کے آگے باراتیوں کے دائرے میں ایک عورت ناچ رہی تھی۔ نوعمر دولہا اپنی ماں کو خوشی سے ناچتے پھولوں کی لڑیوں والے سہرے کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ کشتی آئی۔ خالی ہوئی۔ بارات کشتی میں بیٹھنے لگی۔ ساری کشتی عورتوں سے بھر گئی۔

''مائیو، اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ مردوں کے بغیر جاؤ گی کیا؟'' دولھے کا باپ کہنے لگا۔ عورتوں نے اِدھر اُدھر ہو کر جگہ کی۔ بچوں کو گود میں بٹھایا۔ مرد بیٹھے۔

''ادا، وزن سڑئی زیادہ ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اتارو، میں دوبارہ آ کر اٹھاتا ہوں،'' ملاح کہنے لگا۔

ٹوتری: چھوٹی بانسری۔ سیر: بہاؤ

''یار، بارات جدا کرو گے کیا؟''

''ادا، دریا میں چڑھاؤ ہے۔ سیر تیز ہے۔ وزن زیادہ ہوگا تو مامرا اوپر نیچے نہ ہو جائے۔ میری ذمے داری نہ ہوگی۔''

''یار خامخاہ (خوامخواہ) وہم نہ کر۔ سائیں بخشت شاہ کے آسرے پہنچ جائیں گے۔ چل تو۔''

''جو تمھاری مرضی!'' کشتی بھرے برتن کی طرح چھلک رہی تھی۔

''ادا، ہمیں بھی لے چلو۔ بہت دور جانا ہے۔ عورت ذات ساتھ ہے۔'' پیرل کی منت پر ملاح نے دولھے کے باپ کو دیکھا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ بھری کشتی میں بیر سے بار پڑے گا کیا؟ آؤ ادا، آؤ۔''

''رب خیر سے پار لے جائے، باقی وزنڑا (وزن) مڑئی خاصا ہے۔'' ملاح فکر میں تھا۔

''یار، اچھا جملہ نکال منھ سے۔ خامخاہ ایسے بول رہا ہے!'' دولھے کے باپ نے ملاح سے کہا۔

''سائیں بخشت شاہ بادشاہ کا نام لے کر چل۔ سائیں کے نام سے ڈوبی کشتی بھی تر جائے گی۔''

ملاح نے تختہ اٹھایا۔ بانس کنارے پر گاڑ کر کشتی دھکیلی۔ کشتی گہرے پانی کی طرف چلی۔

''امڑ راستہ دو، ابا راستہ دو!'' کہتے ہوئے ملاح چپو کی طرف جانے لگا۔ پیچھے جانا مشکل ہو گیا تھا۔ لوگ کشتی کے کنارے بھی بھرے ہوئے تھے۔ کشتی جوں جوں آگے چلتی گئی، پیرل کو یوں لگا جیسے لکڑی کی نہیں پتھر کی بنی ہو۔ اس کا پیندا معمول سے زیادہ پانی میں تھا، جیسے کوئی چیز دھنس گئی ہو۔ کشتی بالکل آہستہ آہستہ چل رہی تھی، گویا پانی کے بجائے ریت میں دھکیلی جا رہی ہو۔ بارات کچے کی ہی تھی جن کا ملاح سے اپنا حساب کتاب تھا۔ ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے وہ گندم اترنے پر کرایہ گندم کی صورت یک مشت ایک یا دو من ادا کر دیتے تھے۔ ملاح نے پیرل کے ساتھ بیٹھے ہوئے سے کرایہ لینے کا کہا۔ بھری کشتی میں اس کا پیرل تک پہنچنا مشکل تھا۔ کشتی ایک ایک سوت آگے بڑھتی رہی۔ کھلے دریا میں عورتیں سہرے گائے جا رہی تھیں۔ مٹیالے پانی میں کشتی کو دھکیلتے ملاح اس پار پہنچ جانے کی فکرات میں تھے۔

''کشتی میں پانی بھر رہا ہے!'' خوف سے بھری آواز آئی۔ کشتی کے پیندے سے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ سہرے چیخوں میں بدلے۔

''خیر ہے خیر! اتنا پانی نہیں۔ ملاح وارو کر۔ کنارہ بس دور نہیں،'' دولھے کا باپ چلّایا۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا وزن زیادہ ہے۔''

''یار، تو زبان نہ چلا، ہاتھ چلا ہاتھ۔ اڑے شفو، تو بھی ہاتھ ڈال!'' دولھے کا باپ اپنے رشتے دار کو ملاح کی مدد کے لیے بلانے لگا۔ شفو نے اٹھ کر چپو میں ہاتھ ڈالا۔ دونوں کے ہاتھ چپو پر زور لگانے لگے۔

''عورتوں سے بولو چیخیں مت۔ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔ کوئی ہلے جلے نہیں۔''

بازو مشین بن گئے۔ وہ اپنا پورا زور لگائے جا رہے تھے۔ کنارہ سامنے ہی تھا مگر کشتی آہستہ آہستہ پانی میں اترتی جا رہی تھی۔ کنارے پر کھڑے لوگوں کو یہ ماجرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہراس میں آ گئے تھے۔ کچھ تو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں آگے بڑھ آئے تھے۔

''باقی تھوڑا بچا ہے۔ ہمت کر ہمت!'' کنارے پر کھڑے لوگ ملاح کو ہمت دلانے لگے۔

کشتی میں حشر کا عالم تھا۔ رونا، پکاریں، التجائیں۔ سانس حلق میں تھی۔

''جو سامان ہے وہ پھینک دو!'' ملاح کے چلّانے پر سامان کی کچھ گٹھڑیاں پانی میں پھینک دی گئیں۔ رلی اور سامان کی گٹھڑی پھینکنے کے بعد پیرل نے بیٹے کو گود میں کر لیا۔ کنارہ بس دس پندرہ ہاتھ دور تھا کہ ایک لہر آئی اور کشتی کے اندر بھر گئی۔ لوگ بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ کشتی ڈولنے لگی۔ کوئی ڈر میں مبتلا اٹھا اور کشتی سے پانی میں چھلانگ ماری۔ اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور بھی پانی میں کود دے۔ کشتی پنگھوڑے کی طرح ڈولی اور توازن خراب ہونے سے الٹ گئی۔ غوطے کھاتے ڈوبتے لوگ ہاتھ پاؤں مارتے کنارے پر نکلے۔ کنارے والے بھی پانی میں کود کر لوگ باہر کھینچ لانے لگے۔ باراتیوں میں بھی کچے والوں کی اکثریت تھی اس لیے زیادہ تر تیراکی سے واقف۔ مل ملا کر عورت بچے نکال لیے گئے۔ پیرل ہاتھ مارتا کندھے پر بیٹا لیے نکلا تو بیوی کا خیال آیا۔ وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ اسے وہ کہیں نظر نہ آئی۔

''اڑے میری بیوی کو بچاؤ، میری بیوی کو بچاؤ!'' کہتے وہ کنارے پر دوڑنے لگا۔ اس کے ہوش گم تھے۔ کسی نے بچاؤ بچاؤ کی آواز سنی۔ دیکھا تو اوندھی کشتی کا سہارا لیے کوئی ڈوبتا ابھرتا جا رہا تھا۔

''وارو کرو، مائی ڈوب رہی ہے!''

لوگ دوڑے۔

"ارے یہ تو بھرجائی سلیمت ہے!" کہنے والے نے کہا اور بجلی کی رفتار سے دوڑا۔ جب سلیمت کو نکال کر نڈھال حالت میں پیرل کے حوالے کیا تو پیرل کو بھی معلوم نہ ہوا یہ علو ہے جو اُس پار بیل لینے جارہا تھا۔ علو کے رومال میں لپٹی سلیمت کے بالوں سے ٹپ ٹپ پانی گر رہا تھا۔ وہ شوہر کو دیکھ کر رونے لگ گئی۔ پیرل بیوی پا کر جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ اس کی دلداری کرنے لگا۔ دریا کی سطح پر لوگوں کی جیب سے نکلنے والا چھوٹا موٹا سامان تیرتا جارہا تھا۔ باراتی ملاح کو گالیاں سنا رہے تھے جو اپنی ڈوبی ہوئی کشتی کو کنارے لانے کی فکر میں کنارے کنارے دوڑا جا رہا تھا اور بارات میں آئی بڑی بوڑھیاں دلہن کی بدبختی کا یقین کیے بارات کی وہیں سے واپسی کا کہہ رہی تھیں۔

پیرل والوں کو سائیں بخشت شاہ بادشاہ سے واپس آئے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ پیرل نے ڈوبنے سے بچ جانے کی وجہ سے خیرات کی تھی جس میں پیسوں کا باقی سب حصہ دیگ اتارنے میں خرچ کر دیا تھا۔ اسی عرصے میں علو کی سلیمت کو ڈوبنے سے بچانے والی بات گوٹھ میں خوب پھیل چکی تھی۔ اندر باہر اس کا ذکر ہوا تھا۔ کچھ کے کانوں تک رہی تو کسی کے دل میں جا کر اس نے جڑ پکڑ لی۔ جڑ پھیل کر وہم بنی۔ وہم سے دسواس پیدا ہوا۔ وسوسوں کو ہوا ملی تو شک کے کیچوے کلبلانے لگے۔ کیچوے سنپولے میں تبدیل ہوئے اور اپنا زہر زبان سے اگلنے لگے۔ جگہ جگہ علو اور سلیمت کی بات ہونے لگی۔ جو کوئی سنتا، ایک گرہ اس میں اپنی طرف سے لگا دیتا۔

"وہاں سو پچاس اور بھی تھے۔ ان میں سلیمت کا اپنا مڑس بھی۔ پھر بھی علو نے جا کر کیوں نکالا؟ ہم نہیں کہتے کہ کوئی بات ہوگی، پر کہنے والے تو کہتے ہیں نا!"

"سائیں، کہنے والے تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ بھلا مائی کو اولاد کیوں نہیں ہوتی؟ حالانکہ پیرل کے پہلے بھی بچے ہیں۔ آخر کوئی تو حساب کتاب ہے نا!"

"کچھ تو ہے یار۔ کچھ نہ ہوتا تو ایسی بات کیوں ہوتی؟ بھلا اور کچھ نہیں تو کوئی علو سے پوچھے، تمھارا کیا کام جو پرائے ننگ کو نکالا؟ مرجاتی تو تیرا کیا جاتا؟ اس کا مڑس نہیں نکال رہا، علو نکال رہا ہے! کچھ ہے اس لیے تو نکالا نا!"

''ہاں سائیں، مائی گھر کی دیوار کے پیچھے کچرا پھینکتی ہے۔ اُدھر جدھر علو کی زمین ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے آپس میں بولتے۔''

''ادا، عورت ذات کو کوئی پیر فقیر بھی نہ پہچانے۔ بیچارہ پیرل اس مائی کو کیا پہنچے گا!''

''سائیں، لاکھ کی بات کی تونے۔ عورت ذات؟ توبہ سائیں توبہ! اپنی پر آئے تو مڑس کی موجودگی میں یار بلائے۔''

''مکریلی مائی سے رب بچائے تو بچائے، ورنہ آدمی نہ بچے۔''

''ادا، جب پیرل یہ رن لے کر آیا تھا مجھے تب ہی کھٹک گیا تھا، رب ہمارے گوٹھ کو بچائے۔''

''سائیں، عورت ذات گوٹھ تو کیا ملک برباد کر دے۔''

''ادا، ہماری عورت ہمارے آگے زبان کھولے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ یہ مڑس کو انگلی پر اٹھاتی ہے، انگلی پر بٹھاتی ہے۔''

''ہا سائیں، اس لیے تو علو جیسے آدمی کو بہکا دیا۔ ورنہ علو جیسا بھی ہے، کسی کے ننگ کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔''

ایسی باتیں ہر بیٹھک کا حصہ بن چکی تھیں۔ لوگ اپنے ہم خیال کے ساتھ بیٹھ کر یہ قصہ چھیڑتے، پھر اسی میں لگے رہتے۔ پیرل اور اس کے قریبوں کے لیے یہ بات ابھی دور تھی۔ ان کو کون بتائے؟ اور اگر کوئی بتائے تو کیا؟ باقی علو کو اس کے کسی اپنے نے بھگا دیا۔

''بات کیا کرتا ہے؟'' علو نے پہلے پہل سنا تو بولنے والا کا گریبان چیر دیا۔

''مجھے کیوں کہتا ہے؟ سارا گوٹھ ایسے کہہ رہا ہے۔ ماما خراب ہے۔ نکل جا۔''

''اڑے قسم پنجتن پاک کی، ماما کی بیوی میری بہن جیسی ہے۔ بھلے قرآن اٹھوائیں مجھ سے۔''

''کوئی چوری کی بات ہے جو تجھ سے قسم قرآن لیں گے؟ تجھ سے کون قسم لے گا اس بات کا؟ سمجھ آ رہی ہے کہ نہیں؟ پہلے گردن اتاریں گے، پھر ہو گی بات۔''

''ادا، رب جانتا ہے میں کالا نہیں۔ جو حساب ہو میں دینے کو تیار ہوں۔''

''کیا دے گا حساب؟ ہاں؟ تجھے پتا ہے نا، قوم راج میں کالے کا حساب کیا ہے؟ موت۔ اور کوئی حساب نہیں۔ اب تو کالا ہے بس۔ پورا گوٹھ تجھے کالا کہہ رہا ہے۔ تو اب زندوں میں نہیں، مُردوں

میں ہے۔ دیر بس اتنی ہے، بیرل کو پتا چلے۔ پہلے وہ بیوی کا سر اتارے گا پھر تیرا۔ ابھی کے ابھی بھاگ جا۔“

علو بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں میں غل اٹھا۔ جیسے گلیوں میں بپھرا سانڈ گھس آئے۔

اُس سویر ہوا چل رہی تھی۔ سورج کی تیزی پہنچنے والی ہوگی۔ برگد کے نیچے ماما بیرل سامان لے کر پہنچا ہی تھا کہ اس کے آگے چاچا علی حیدر کلہاڑی لے کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ جو تو رندا چلاتا ہے اپنی آنکھوں پر چلا!“ چاچے علی حیدر کی سفید مونچھیں تھرتھرا رہی تھیں۔

”کیا ہو گیا چاچا؟ صبح صبح اتنا گرم ہو گیا ہے۔ شربت وربت پلاؤں کیا؟“ بیرل نے بات اُڑانا چاہی۔

”یہ شربت ڈال اپنی گاف میں! اس اندھے کو دیکھ، اسے ابھی پتا ہی نہیں کیا ہوا ہے،“ چاچے علی حیدر نے شیرل گدھا گاڑی والے کو دیکھ کر کہا۔

”چاچا، ماجرا کیا ہے؟“

”تجھے ہوتی نا گیرت تو تجھے سب پتا ہوتا، بے گیرت!“

”چاچا، خامخواہ نہ بول!“

”میں بولتا ہوں، تُو بے گیرت ہے بے گیرت!“

”چاچا، میں کہتا ہوں گالی نہ دے۔“ بیرل سامان چھوڑ کر تختے کے پیچھے سے نکل آیا۔

”میری گالی پر تجھے گیرت آ رہی ہے۔ ہاں؟ اس پر نہیں آتی کہ تیری بیوی علو کے ساتھ مزے کرتی ہے۔“

”چاچا، سفید سر والا ہے، زبان سنبھال اپنی!“ بیرل کے دانت بھنچ گئے۔ سانس آواز کر کے نکلنے لگی۔

”سنبھلتی تجھ سے بیوی نہیں، اور میں اپنی زبان سنبھالوں!“

”چاچا، میں آخری بار کہتا ہوں، بیوی پر مت جا ورنہ اچھا نہیں ہوگا!“ بیرل نے چاچا علی حیدر کا گریبان پکڑتے پکڑتے خود کو روک لیا۔

”میں کیوں جاؤں گا تیری بیوی پر بے گیرت! علو جاتا ہے تیری بیوی پر، علو!“ علو کہتے چاچا علی

حیدر کے منھ سے تھوک اڑی۔

''شیرل، میں کہتا ہوں چاچے کو لے جا، ورنہ گند ہوگا آج!''

''اڑے کنجر! اور کیا گند ہوگا؟ تیری بیوی علو کے ساتھ سوتی ہے، تو یہاں مہندی پی کر سویا ہوا ہے۔ ایسی بے گیرتی ہم نہ ہونے دیں گے۔ ہم تیری طرح اپنی رنوں کو رنڈی نہیں بننے دیں گے۔''

''چاچا، میرا ہاتھ اٹھا تو پھر روکوں گا نہیں خود کو۔''

اتنی دیر میں کچھ اور لوگ ہل ہنگام کی وجہ سے پہنچنے لگے۔

''تجھ جیسا کنجر میں نے قوم میں نہ دیکھا۔ میں تجھے بول رہا ہوں تیری بیوی کالی ہے، اور تُو یاؤں یاؤں کیے جا رہا ہے۔ دل کرتا ہے تیری مونچھیں مونڈ کر تیری گاف میں ڈال دوں!''

آدمی کافی جمع ہو گئے تھے۔ سب چپ کھڑے سنے جا رہے تھے۔

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں جس دن رب گیرت تقسیم کر رہا تھا یہ بھڑوا اس دن بھی پاد مارنے میں لگا ہوا تھا!'' چاچے علی حیدر نے گاؤں والوں کی طرف منھ کیا اور زور سے بولا۔

''چاچا فضل، یہ اچھی بات نہیں۔ چاچا علی حیدر گالیاں دے رہا ہے اور تُو بھی چپ کر کے کھڑا ہے۔''

''اڑے تو مجھے کرے گا کیا چکلائی!'' چاچا علی حیدر کا جسم لرزے جا رہا تھا۔ ''میں تیری بیوی کے اپھال (افعال) تجھے بتا رہا ہوں اور تُو اس کی جا کر گردن نہیں اتارتا مادرچ...''

پیرل نے دیکھا، وہاں کھڑے سب لوگوں کے چہروں پر یہی تحریر لکھی تھی۔

''اڑے فضل، سنا۔ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟'' چاچے علی حیدر کا رخ میاں محمد فضل کی طرف ہو گیا۔

''بات برابر ایسی ہے۔''

''سنا؟ سنا تُو نے بھڑوے؟ اگر تو نے بیوی کی گردن نہیں اتارنی دتے، تو اس کی شلوار اتار دے، اس کے یار کو تکلیف نہ ہو!''

سارا مجمع پیرل میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔

چکلائی: دلال، بھڑوا۔

''میں اس رنڈی کو نہیں چھوڑوں گا!'' پیرل غیظ وغضب میں گاؤں کی طرف اونچائی پر دوڑا۔

''وہاں پاد مارنے جارہا ہے بے گیرت؟ یہ کلہاڑی تیرا باپ لے جائے گا!'' پیچھے سے چاچے علی حیدر کی ابلتی آواز آئی۔

وہ پلٹا اور کلہاڑی ہاتھ میں کی، دیوانہ وار ٹیلے کی طرف جاتے غائب ہوگیا۔ اوپر گوٹھ والوں میں سے کچھ نے چیخوں کی آواز سنی۔ مجمع برگد تلے جما رہا۔ کچھ دیر میں پیرل خون پسینے میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی جھول رہی تھی۔

''شاباش!'' چاچا علی حیدر اس کی طرف دوڑا۔ اس نے لاٹھی پھینک کر پیرل کا ماتھا چوما۔ ''یہ ہوا مردوں والا کام۔ چلو ڑے، سارے تھانے چلتے ہیں،'' اس نے سارے مجمعے کو پکارتے کہا۔ ''اڑے فضل، یہ اپنی پگ اتار کر دے۔''

چاچے علی حیدر نے میاں محمد فضل سے اس کی بوسکی کی پگ لی اور بندھی حالت میں پیرل کے سر پر جمادی۔

''آج تو مونچھ اوپر کر کے چل۔ شاباش! آگے چل ہمارے آگے!'' چاچے علی حیدر نے اپنے ہاتھ سے پیرل کی مونچھوں کے کونے سنوارتے بچھو کے ڈنک کی طرح اوپر کر دیے۔

پیرل کے دائیں بائیں چاچا علی حیدر اور میاں محمد فضل اور پیچھے پورا مجمع تھا۔ اس کی مونچھ کے بالوں میں اٹکا ایک خون کا قطرہ لرزے جا رہا تھا۔

❄❄

ذکیہ مشہدی

پارسائی بی کا بگھار

(منتخب کہانیاں)

Rs.550

صدیق عالم

دو ناول

چینی کوٹھی

صالحہ صالحہ

Rs.600

شمس الرحمٰن فاروقی

سوار

اور دوسرے افسانے

Rs.600

سید رفیق حسین

آئینۂ حیرت

اور دوسری تحریریں

Rs.400

ژولیاں

تین ناولٹ

ساغر

میرا جی کے لیے

منیر جعفری شہید

Rs.375

صدیق عالم

نادر سکوں کا بکس

Rs.450

جیم عباسی کی کہانیاں پچھلے چند برسوں میں آج سمیت کئی ادبی رسالوں میں شائع ہو کر پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر چکی ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ سندھ کے دیہی پس منظر میں اتنی موثر کہانیاں اردو میں اس سے پہلے سامنے نہیں آئیں۔ یہ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کا ناول رقص نامہ بھی جلد شائع ہونے والا ہے۔ جیم عباسی 1978 میں سندھ کے مقام کنڈیارو میں پیدا ہوئے، جو اُس وقت ضلع نواب شاہ میں تھا اور اب نوشہرو فیروز ضلعے کا حصہ ہے۔ انھوں نے کنڈیارو ہی میں مذہبی نوعیت کی تعلیم حاصل کی اور وہیں پرورش پائی، اور بعد میں حیدر آباد اور پھر کراچی منتقل ہوئے جو اَب ان کا گھر ہے۔

سرورق : اسد فاطمی

ISBN: 978-969-648-052-5

9 789696 480525 >

Rs.600